الاصلاح

دائرہ حمیدیہ کا ماہوار علمی و مذہبی رسالہ

مرتبہ

امین احسن اصلاحی

رجسٹرڈ نمبر ا۔ ۲۹۰۲

دائرہ حمیدیہ کی اعانت

دائرہ حمیدیہ کی خدمت و اعانت، کتاب الٰہی کی خدمت و اعانت ہے، اس کی تین صورتیں ہیں۔

۱۔ جو حضرات سو روپے یکمشت دائرہ کو عنایت فرمائیں گے وہ دائرہ کے معاون دائمی تصور ہوں گے ان کو دائرہ کا رسالہ "الاصلاح" اور تمام مطبوعات برابر ہدیۃً دی جائیں گی۔

۲۔ جو حضرات پچاس روپیہ یکمشت عنایت فرمائیں گے۔ ان کو رسالہ الاصلاح اور دائرہ کی دوسری مطبوعات برابر نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

۳۔ جو حضرات دس روپے سالانہ عنایت فرمائیں گے ان کی خدمت میں الاصلاح ہدیۃً جاری کیا جائے گا اور سال بھر کی مطبوعات بلا قیمت بھیجی جائیں گی۔

ہدایات و قواعد

۱۔ الاصلاح ہر انگریزی مہینہ کی پندرہ تک شایع ہوگا۔

۲۔ اگر مہینہ کے آخر تک پرچہ نہ پہنچے، فوراً دفتر کو لکھ کر منگوا لیجئے ورنہ بقیمت بھیجا جائے گا۔

۳۔ مضامین وغیرہ اڈیٹر کے نام بھیجئے اور دفتر سے متعلق امور کے لئے تمام خط و کتابت منیجر سے کیجئے۔

۴۔ دفتر سے خط و کتابت کرنے میں خریداروں کو نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہئے۔

۵۔ چندہ سالانہ چار روپے۔ بیرون ہند کے لئے چھ روپے۔ فی پرچہ چھ آنے۔

عبدالاحد اصلاحی منیجر دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ

محمد لائق طابع و ناشر نے اصلاح پریس سرائے میر اعظم گڑھ میں چھپوا کر شائع کیا

دائرۂ حمیدیہ کی اردو مطبوعات

تفسیر سورۂ اخلاص

استاذ امام علامہ فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے سورۂ اخلاص کی تفسیر اردو میں لکھی ہے۔ اس سورہ کی ہر دور میں بیشمار تفسیریں لکھی گئیں۔ لیکن اہل نظر نے اعتراف کیا ہے کہ علامہ فراہیؒ کی تفسیر میں جو نکتے بیان ہوئے ہیں۔ ان سے تمام تفسیریں خالی ہیں۔ کتابت و طباعت بہترین۔ کاغذ نہایت عمدہ۔ قیمت ۱-۵ر

تفسیر سورۂ کوثر

استاذ امام علامہ حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سورۃ الکوثر کا اردو ترجمہ ہے۔ اسمیں کوثر کی تحقیق، خانہ کعبہ کی روحانی حقیقت اور نماز اور قربانی کے اسرار و حقائق پر مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اسکی اصلی عظمت کا اندازہ صرف مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ کتابت و طباعت جاذب نظر۔ کاغذ عمدہ تقطیع ۳۰×۲۰/۱۶ حجم ۱۴۴ صفحے قیمت ۸-۰ر

تفسیر سورۂ لہب

استاذ امام علامہ حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سورۃ اللہب کا اردو ترجمہ ہے۔ اسمیں عام خیال کی مدلل تردید کی گئی ہے کہ یہ سورہ بددعا ہے۔ ابولہب اور اس کی بیوی کے وجوہ ذکر نہایت اثر انگیز ہیں۔ اس تفسیر کی اصلی عظمت کا اندازہ صرف مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ کتابت و طباعت بہتر کاغذ نہایت عمدہ۔ حجم ۴۰ صفحے قیمت ۲ ر

منیجر

جلد ۳	ماہ رجب المرجب ۱۳۵۵ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۳۶ء	نمبر ۹

فہرست مضامین

شذرات	امین احسن اصلاحی	۵۱۳ - ۵۲۰
معارف قرآن		
تفسیر سورہ قیامہ	استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ	۵۲۱ - ۵۲۸
ذبیح کون ہے؟	" " "	۵۲۹ - ۵۳۴
ہدایت کا مفہوم اور اس کے اقسام	جناب مولوی حافظ عبد الاحد صاحب اصلاحی	۵۳۵ - ۵۴۱
مذاکرہ		
بلاغ الحق	جناب مولوی حافظ سید محمد طٰہٰ اشرف صاحب محوی	۵۴۲ - ۵۴۸
مقالات		
سیرت شبلی	جناب مولانا اقبال احمد صاحب سہیل ایم اے علیگ	۵۴۹ - ۵۵۳
تصوف اسلام	جناب ڈاکٹر احمد غلوش	۵۵۴ - ۵۶۲
اشتراکیت پر ایک سرسری نظر	جناب مولوی عبد الرحمن صاحب ناصر اصلاحی	۵۶۳ - ۵۷۰
حکمت مغرب		
مارکس اریلیس کے خیالات	جناب مولوی نیاز احمد صاحب صدیقی ایم اے	۵۷۱ - ۵۷۲
تقریظ و تبصرہ	ع۔ ن	۵۷۳ - ۵۷۶

شذرات

اس مہینہ میں علماء کی تنظیم سے متعلق بعض ضروری باتیں لکھنی تھیں۔ پچھلے پرچہ میں ہم نے وعدہ بھی کیا تھا۔ لیکن برما میں ہندوستانیوں کے بیدردانہ قتل عام کا معاملہ متقاضی ہے کہ اس مرتبہ یہ صفحات ان خونیں حوادث کے تذکرہ کی نذر ہوں۔

اس ہنگامۂ خونیں کے بعض مناظر کی تصویریں ایک دردمند مسلمان نے چھاپ کر شائع کر دی ہیں۔ ان کا ایک مجموعہ ہمارے سامنے ہے۔ ان مناظر کو دیکھ کر کلیجہ شق ہوتا ہے۔ جلتی ہوئی مسجدوں اور مدرسوں کے سیاہ پوش نشانات۔ قرآن مجید کے پراگندہ اوراق کے انبار، مساجد کے صحنوں میں اماموں کے کٹے ہوئے سر اور پارہ پارہ جسم۔ محرابوں اور دیواروں پر ان کے مقدس خونوں کے دھبے۔ چھ چھ مہینہ کے معصوم بچوں کی دو نیم لاشیں۔ بوڑھوں، نوجوانوں، عورتوں، مسلمانوں، ہندوؤں کے بکھرے ہوئے اعضاء! اللہ اکبر! کس انسان کا دل ہے جو ان ہولناک مناظر کو دیکھ کر پھٹ نہ جائے گا!

اور یہ سب کچھ برما کے جنگلوں کے درندوں نے نہیں، وہاں کے شہروں اور قصبوں کے انسانوں نے کیا ہے۔ غدر اور طوائف الملوکی کے زمانہ میں نہیں، ایک مہذب اور آئینی گورنمنٹ کی موجودگی میں کیا ہے۔ کرۂ ارض کے کسی مجہول اور بعید گوشہ میں نہیں، ایک ایسے ملک میں کیا ہے جو ابھی کل تک اسی ہندوستان کا ایک جزو تھا، اور آج بھی اسی شہنشاہی کے ماتحت ہے جس کے تمام سلطنت کا ہندوستان نگیں ہے۔ اور کسی ایک دو شہر میں نہیں کیا ہے کہ اس کو عارضی ہیجان و بحران کا نتیجہ سمجھا جائے۔ پورے ملک کے طول و عرض میں، شہر شہر میں، قصبہ قصبہ میں، گاؤں گاؤں میں کیا ہے۔ پھر دو ایک دنوں میں یہ سب کچھ نہیں کر ڈالا ہے کہ حکومت کی پولیس سوتی رہی ہو اور چپ چپاتے یہ سب کچھ ہو گیا ہو۔ اور ان قلعوں تک آہوں اور فریادوں کی چیخیں نہ پہنچی ہوں جہاں امن کا دیوتا سنگینوں، ہوائی جہازوں اور مشین گنوں کے حصار میں اسی انتظار میں اضطراب کی صبحیں اور بے چینی کی شامیں گذارتا ہے کہ کوئی پکارے تو وہ جواب دے اور کوئی چیخے تو وہ فریادرسی کرے اور جس کا سب سے بڑا مقصد صرف اقلیتوں کی جان و مال کی حفاظت ہے۔

یہ سب کچھ کن کے ساتھ کیا گیا ہے؟ ہندوستانیوں کے ساتھ۔ کس جرم میں؟ ہندوستانی ہیں۔ معتبر بیان کے مطابق ۵۰۰ ہندوستانی قتل ہوئے۔ ایک ہزار سے زیادہ زخمی ہوئے۔ دو ہزار دوکانیں لوٹ لی گئیں اور کم سے کم ایک کروڑ روپیہ کا مالی نقصان ہوا اور ہزاروں ہندوستانی اس طرح سے وہاں سے بھاگے کہ ان کو اپنے بیوی بچوں تک کا ہوش نہیں۔ جہازی کمپنیوں کی رعایت سے کسی طرح اپنے ملک میں پہنچ گئے۔ ع رضیت من الغنیمۃ بالایاب

اور ان ہندوستانیوں کے اندر ظلم و ستم کے اصلی ہدف مسلمان تھے۔ ۵۰ فیصدی جانی و مالی نقصان انہی کا ہوا اور اصل یہ ہے کہ وہاں ہندوستانی مسلمانوں کو کاروبار میں جو حیثیت حاصل تھی وہ کسی کو حاصل نہ تھی اس لئے قدرتی طور پر اصلی نشانہ وہی ہوئے اور افسوس ہے کہ بری طرح برباد کر دئے گئے اور گو اب قیام امن کے لئے ایک آرڈیننس جاری کیا گیا ہے لیکن یہ آرڈیننس بھی برما سے ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کے اخراج کا ایک پنجسالہ پروگرام ہے۔

ان تمام حالات میں حکومت ہند کا جو فرض تھا اور اس کو اس نے جس طرح انجام دیا اور آئندہ جو کچھ کرے گی اس کی پوری تفصیل مرکزی اسمبلی کی ان تقریروں میں آگئی جو اس مسئلہ پر کی گئیں اور احمق ہے وہ انسان جو حکومت ہند سے اس سے زیادہ توقع رکھتا ہے۔ ہم اپنے جگر کا درد انگریزی حکومت کے سرد سینہ میں ڈھونڈتے ہیں اس سے بڑھ کر سادگی اور کیا ہو سکتی ہے؟ لیکن جب حکومت ہند کچھ نہیں کر سکتی تو وہ مظلوم ہندوستانی کیا کریں جن کو دوسرے بجرم ہندوستانیت بلا امتیاز نسل و خون و بلا تفریق مذہب و ملت قتل کرتے ہیں۔ برمیوں نے ہندوستانی مسلمانوں، ہندوؤں، سکھوں، عیسائیوں کی لاشوں کا قیمہ ایک ہی چھری سے کیا کہ یہ سب ہندوستانی ہونے کے مجرم ہیں؟ لیکن ہمارے ہندوستانی کے نزدیک کہتے ہیں کہ اگر ہم اپنی جان و مال اور عزت و ناموس کی حفاظت کے لئے ہندوستانیوں کا ایک متحدہ محاذ قائم کریں اور مسلمان اس میں شریک ہوں، تو یہ شرک و ارتداد ہے۔ برما میں ہندستانیت جرم ہے، سیلون میں ہندوستانیت جرم ہے، جنوبی افریقہ کی گوری گورنمنٹ کے نزدیک تمام کالے (Non whites) مجرم ہیں۔ جنہیں ہماری لیگ کے نامزد بھی غالباً شامل ہوں، گولڈ لا (Gold Law) اور لا نمبر ۳ موجود ہیں۔

باقی رہی مسلم لیگ تو حیرت ہے کہ مسلمان اس سے کسی دینی و دنیوی بھلائی کی توقع رکھتے ہیں۔ لیگ کے نتائج کے بعد مسٹر جناح نے علیگڑھ کی ایک تقریر میں کہا تھا کہ لیگ ابھی شش ماہہ بچہ ہے۔ ابھی اس کے کاموں کی بابت سوال قبل از وقت ہے۔ مستقبل کا انتظار کرنا چاہئے۔ گو ہم ان کی اس بات سے کچھ مطمئن نہیں ہوئے تھے کیونکہ لیگ کے پہلے جنم کے کارناموں سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ یہ دوسرا جنم پہلے جنم کے اعمال و افعال ہی کا مظہر ہوگا، تاہم ظن المؤمن خیر کے اصول پر خاموش رہے کہ بات ٹھیک ہے کچھ دن دیکھنا چاہئے۔ پہلے جنم کے اعمال کیسے ہی کچھ ہوں اس دوسرے جنم میں کم از کم ایک بات تو خوشی کی ہے کہ انہیں کے کانوں میں مولانا حسرت نے آزادی کامل کی اذان دی تھی اور انہی نے سب سے پہلے بڑھ کر اس کو گود میں لیا ہے۔ پس لیگ مس خام سہی لیکن ایک ماہر کیمیاگر کی کیمیاگری بھی تو آخر کوئی چیز ہے؟

بادہ گر خام بود پختہ کند شیشۂ ما

چنانچہ ہم نے انتظار شروع کیا اور لیگ کے شش ماہہ بچے نے اپنا کام۔ اس نے علما کو گالیاں دینی شروع کیں اور خوب گالیاں دیں۔ ہم کو بچے کے کارناموں کی بسم اللہ گالیوں سے کچھ مبارک نہیں معلوم ہوئی مگر چپ رہے کہ بچپن ہے۔ بالآخر بنگال کے اس مشہور اعلان میں جس میں زبان لیگ کے تمام شیر موجود تھے بچے کے پہلے کارنامہ کا اعلان مسٹر جناح نے ان لفظوں میں کیا کہ "اس بچے نے چند مہینوں کے اندر مسلمانوں کو ملاؤں اور مولویوں کے پنجہ سے چھڑا لیا"۔ یہ بات نہایت خوشکن تھی اور مسلمانوں کیلئے فال نیک۔ مگر ابھی کے ساتھ جب مولانا ظفر علی خاں نے مسجد شہید گنج کے لئے عملی جد و جہد کی تجویز پیش کی اور بچے نے کہا "نہیں" تو ہم کو اس کے مستقبل کیطرف سے بہت مایوسی ہوئی اور پھر دہلی اور بمبئی وغیرہ کے اجلاسوں میں معلوم ہوا کہ یہ "نہیں" اس کی مستقل فطرت ہے۔ فلسطین کیلئے کوئی عملی جد و جہد کی جائے؟ نہیں! انگریزی مال کا بائیکاٹ کیا جائے؟ نہیں! خطابات واپس کئے جائیں؟ نہیں! مگر اقتضاء جنگی خیر، وہ حسن ظن جنکی فطرت ہو وہ اس "نہیں" "نہیں" سے کیا بدظن ہوتے۔ انھوں نے دل کو سمجھا لیا کہ

سیانے ہوں گے تو "ہاں" بھی ہوگی ابھی تو سن ہے "نہیں نہیں" کا

خدا سچے طالبوں کو کبھی مایوس نہیں کرتا۔ چنانچہ بڑی التجاؤں کے بعد بالآخر وہ ساعت ہمایوں آہی گئی کہ جو اب تک صرف نہیں سے آشنا تھی وہ پہلی بار "ہاں" کی صدائے روح پرور و جاں نواز سے آشنا ہوں۔ چنانچہ سنٹرل اسمبلی کے اجلاس میں اس وقت جبکہ آرمی بل پر ووٹ لئے جارہے تھے اور لسان المیزان (Balance power

جکی رو سے ہندوستانیوں کیلئے جائز نہیں کہ وہ ان علاقوں کی زمینیں خرید سکیں جو گورے یورپینوں کیلئے مخصوص ہیں۔ وہاں کی لفٹ کی گوری پشت بھی یہ ننگ نہیں گوارا کر سکتی کہ کسی ہندوستانی کا بوجھ اٹھائے خواہ وہ ہندوستان کی معزز سے معزز اسمبلی کا معزز ممبر ہو یا ہماری کسی خانقاہ کا ہزار پیشانیوں کا مسجود شیخ وقت۔ ہندوستانیوں کی تجارت کو جس طرح برباد کیا جارہا ہے وہ لونگ والے معاملہ میں ہم دیکھ چکے لیکن ان ذلتوں اور بربادیوں کے مقابلہ کیلئے کوئی متحدہ محاذ قائم ہو تو کیا مسلمان بھی بحیثیت ہندوستانی کے اس میں شریک ہو سکتے ہیں؟ نہیں۔ اس سے وحدت اسلامیہ کا رشتہ ٹوٹتا ہے۔ اور قرآن نے ہیئت اجتماعیہ کا جو قانون بنایا ہے، وہ بالکل بے لچک ہے۔

ہمارے یہ نیک متقی اپنے کو ولید اور عبدالملک اور مامون و معتصم کے زمانہ میں دیکھ رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہر طرف اسلامی حکومت کا ایک عالمگیر اقتدار چھایا ہوا ہے اور ہم مسلمان اس کے زیر سایہ ایک مرکز کے ماتحت زندگی بسر کر رہے ہیں۔ پس جس نے اس کے اندر اسلامی وحدت کے علاوہ کسی رشتہ کا نام لیا اس نے ملت کے اندر رخنہ پیدا کیا اور وہ گردن زدنی ہے۔ حالانکہ صورت حالات یہ نہیں ہے۔ اس سے بالکل مختلف ہے۔ ہمارا اسلامی شیرازہ بالکل ابتر ہو چکا ہے۔ پوری ملت اسلامیہ الگ الگ قوموں اور الگ الگ نسلوں کے اندر بٹ کر زمین کے مختلف گوشوں میں بند ہو گئی اور ان میں سے نہ کسی کے اندر صلاحیت ہی ہے اور نہ ولولہ ہے کہ وہ اپنے دائرے سے باہر کے مسلمانوں کے لئے کچھ کر سکے۔ پس دنیا کے جس گوشہ میں بھی مسلمان محکوم ہیں ان کیلئے اس کے سوا کوئی راہ ہی باقی نہیں رہ گئی ہے کہ اپنے ہم وطنوں کے ساتھ جس حد تک وہ اشتراک عمل پیدا کر سکتے ہوں کریں۔ اور اپنی عزت و حرمت کو بچائیں۔ ان کا عمل مضطر کا ہے۔ اگر کوئی مضبوط اسلامی اقتدار موجود ہوتا تو بلا شبہ ان کے لئے صحیح راہ یہی تھی کہ وہ اس سے وابستہ ہو جاتے۔ اگر ان ملکوں کے اندر خود اس پوزیشن میں ہوتے کہ اپنے بل بوتے پر اپنی حفاظت کر سکیں تب بھی ہم یہی مشورہ دیتے کہ وہ دوسروں کی راہ نہ دیکھیں۔ لیکن جب یہ ساری باتیں موجود نہیں ہیں تو اپنے ہم وطنوں کے ساتھ ممکن حد تک اشتراک و تعاون، اور ضروری حد تک افتراق و اجتناب کی راہ کے سوا کوئی راہ نہیں ہے۔ ہٹلر نے اپنی تازہ تقریر میں کہا ہے کہ چیکوسلواکیہ کے سوڈیٹن فلسطین کے عربوں کی طرح بے یار و مددگار ہیں۔ آج کون ہے جو جنوبی افریقہ، برما، اور ہندوستان وغیرہ کے مسلمانوں کیلئے یہی بات کہہ سکے!

کی حیثیت...... لیگ کو حاصل تھی لیگ نے "ہاں" کہا اور وہ "ہاں" کہ شملہ اور دہلی سے لیکر ڈاؤننگ اسٹریٹ لندن تک شاید ہی کوئی اسلام اور مسلمانوں کا دشمن ہو جس کا کلیجہ اس "ہاں" سے چھد نہ گیا ہو۔ اور ہندوستان کی سرحدوں سے لیکر قسطنطنیہ کی دیواروں تک شاید ہی کوئی اسلامی ملک ایسا ہو جو اس پر مسرت کے جشن نہ منائے اور لیگ کی بلائیں نہ لے۔ اکیلے مولانا حسرت اس پر کچھ دل گرفتہ نظر آتے ہیں حالانکہ دل گرفتگی کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، وہ تو شاعر بھی ہیں اور صوفی بھی، ان سے بڑھکر اس "ہاں" سے مزہ لینے والا دوسرا اور کون ہو سکتا ہے۔ ان کو تو اس دن محفل ہی میں اور ممکن ہوتا تو پہلو ہی میں ہونا تھا کہ اس صدائے جان نواز کو سنتے اور مرحوم غالب کا یہ شعر پڑھکر جھوم جھوم جاتے۔

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے ‏ ‏ ‏ جلاد سے لیکن وہ کہے جائیں کہ "ہاں اور"

مسلم لیگ کے متعلق ہم شروع سے جو کچھ لکھ رہے ہیں اس سے بہت سے لوگ نہایت برہم تھے لیکن اب حیرت ہے کہ یہ حضرات لیگ سے بیزار معلوم ہوتے ہیں حالانکہ لیگ جو پہلے تھی وہ اب بھی ہے البتہ یہ حضرات خوش گمان ہوکر بدگمان ہوئے ہیں اور یہ مضمون ہم کو پسند نہیں۔ لیگ کا سب سے بڑا دعوی "آزادی کامل" تھا اور اسکی مدح و منقبت کے ہر قصیدہ کے ٹیپ کا بند یہی ہوتا تھا، حالانکہ جو لوگ اسرار درون پردہ سے واقف تھے وہ جانتے تھے کہ یہ چیز لیگ کے خداوندوں کے حاشیہ خیال میں بھی کبھی نہیں تھی، مولانا حسرت وغیرہ جیسے بعض گرم عناصر کو مطمئن کرنے کیلئے کاغذ پر ایک چیز لکھ دی گئی تھی اور وہ بھی محض اس وجہ سے کہ اب "آزادی کامل" کا لفظ کانگریس کی بدولت لکھنا اور بولنا کوئی جرم نہیں رہ گیا تھا، لیڈروں اور نوابوں کے گھروں تک میں یہی بھاشا بولی جانے لگی تھی۔ پس لیگ کا یہ کارنامہ ایسا نہ تھا کہ جس پر لوگ ہوش و حواس کھو بیٹھتے۔ ٹھیک یاد نہیں، غالباً زیاد کی کارروائی کی کسی نے تعریف کی تو جواب دینے والے نے جواب دیا تھا کہ "آج بنو امیہ کا اقتدار وہ ہے کہ اگر زیاد کی جگہ کوئی لونڈا بھی ہو تو زیاد کے کارناموں سے بڑے کارنامے دکھا سکتا ہے۔" ہم کو لیگ کی آزادی کامل کے ریزولیشن پر یہ واقعہ یاد آیا تھا۔

تاہم کسی کو کچھ شبہ رہا ہو تو اب بہتر ہوگا کہ لیگ کی آزادی کامل والے نصب العین کے فریم میں اس فوجی بھرتی کے بل کو رکھکے دیکھ لے کہ دونوں باہم کیسے رخسار اور تل اور انگشتری اور نگینہ کی طرح موزوں ہو گئے ہیں سچ ہے

ایں دو شمع اند کہ از یکدگر افروختہ اند

مولانا حسرت کا ایک پر معاملہ شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ مگر اسوقت وہ ہمدردی کے مستحق ہیں نہ تعریض کے۔

مسٹر جناح نے اس بل کی حمایت کے جو وجوہ بیان کئے ہیں وہ اخبارات میں آچکے ہیں اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ معاملات پر کس روشنی میں غور کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں "مسلمان اس وقت فوج میں ۵۵ سے ۶۰ فیصدی تک ہیں اگر وہ ان لوگوں (کانگریسیوں) کے گمراہ کن پروپگنڈے سے متاثر ہوکر بغاوت اور غدر پر اتر آئے تو اس سے ان کے پیشے کو بڑا دھکا لگیگا اور ان میں سے بہتیرے سخت سزائیں جھیلیں گے....... اگر کانگریس کامیاب ہو جاتی تو پنجاب گورنمنٹ کی ساکھ اکھڑ جاتی، فوج میں بغاوت پھیلتی اور ساری ذمہ داری پنجاب کی وزارت پر عاید ہوتی جو غالب حیثیت سے مسلمان ہے"۔ (لیڈر ۱۲ ستمبر)

اس وقت ہمارے سامنے ان لوگوں کی تحریریں ہیں جنھوں نے مسٹر جناح کے مذہبی رجحانات کی نہایت زوردار لفظوں میں تعریفیں کی ہیں اور جواہر لال پر بہت خفا ہیں کہ وہ روٹی کے پیچھے مسلمانوں کو دوڑانا چاہتا ہے وہ غور کریں کہ مسٹر جناح کیا کہتے ہیں؟ ریکروٹمنٹ بل پر اس نقطہ نظر سے غور نہیں کرتے کہ قرآن و حدیث اس بارہ میں کیا کہتے ہیں مسلمانوں کی اجتماعی مصلحت کیا ہے وطن کا مفاد کیا ہے، محض اس پہلو سے دیکھتے ہیں کہ ۵۵ سے ۶۰ فیصدی تک مسلمانوں کو جس میں ۱۰۔۱۵ سے ۲۰۔۳۰ روپیہ کی نوکریاں ملی ہیں پس اگرچہ یہ فوج سرحد پر گولہ باری کرے، اگرچہ فلسطین کو رنگ و خون کا جہنم بنادے، اگرچہ ترکوں کا سینہ چھلنی کردے، اگرچہ جزیرۃ العرب پر قبضہ کرلے مگر روٹی وہ چیز ہے کہ اسکی خاطر سب کچھ گوارا، فوج کسی کی ہو اسکا مقصد اگرچہ ہمارے ہی گھر کو ڈھانا ہو مگر جب اس میں ہمارے بھائی ۶۰ فیصدی ملازم ہیں تو جو شخص اس کے خلاف ایک حرف کہے وہ برس کیلئے جیل بھیجا جائے۔ وہ کیا ہے؟ روٹی کی کرامت؛ وہ قرآن و حدیث سب بازی لے گئی فلسطین، قسطنطنیہ، جزیرۃ العرب سب سے آگے نکل گئی اور محمد ۔۔۔ وطن کے پجاری، روٹی کے بندے جواہر لال کی سرکوبی میں نہیں گم، ژلیمو اور مصر کے داعی اور اس ہادی کامل کی قیادت میں جن کو خدا نے چودھویں صدی میں اسلامی تصورات کی تجدید کیلئے مبعوث فرمایا ہے

اگر اسلام نے معاملات پر غور کرنے کیلئے یہی بلند نقطہ نگاہ بخشا ہے تو ہم کو شرم کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ جواہر لال کی روٹی ہماری روٹی سے زیادہ فیاض اور اس کا وطن ہماری جہانگیری سے زیادہ وسیع ہے ہم کو اپنی روٹی کیلئے اپنے ہی بھائیوں کی زندگی چھیننے میں عار نہیں اور پنجاب کی "مسلم" وزارت کی حفاظت کیلئے قرآن کی حرمت سے بھی بے پروا ہو سکتے ہیں، مگر یہ ملحد وطن پرست ایسا نہیں کر سکتے۔ ان کے تصور میں کم از کم

اتنی وسعت ضرور ہے کہ معاملات پر غور کرتے وقت راس کماری سے کشمیر تک نگاہ دوڑا لیتے ہیں۔

ترسم کہ صرفہ نبرد روز باز خواست — نان حلال شیخ ز آب حرام ما

اور مولانا شوکت علی صاحب کی سادگی ملاحظہ ہو وہ مسلمانوں کو اطمینان دلاتے ہیں کہ اگر انگریزوں نے ہندوستان کی فوجوں کو اسلامی ممالک کے خلاف استعمال کیا تو وہ پھانسی پر چڑھ جائیں گے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ابھی تک بالکل بے خبر ہیں کہ ہندوستان کی فوجیں یہ شرمناک کام برابر کرتی رہی ہیں اور آج بھی اسی میں مشغول ہیں۔ جو لوگ آج تک اس کو دیکھ نہ سکے اور عراق سے لیکر فلسطین تک سب کچھ انھی کے ہاتھوں تباہ کرا کے ابتک نئے تجربات و مشاہدات کے منتظر ہیں ان سے کیا توقع کی جائے کہ وہ کل اسکو دیکھکر اپنی گردنیں پھانسی کی رسی میں ڈال دیں گے۔ اگر انھوں نے سچ مچ ابتک یہ حیرت انگیز تماشہ نہیں دیکھا ہو تو ہم ان کو ۱۴ ستمبر کے لیڈر کا حوالہ دیتے ہیں کہ ۱۰ ستمبر کو ایک تازہ بیچ ہندوستان سے سو دستے فلسطین کیلئے روانہ ہوا ہے۔

ہم نے کہا تھا کہ مسلم لیگ کی تنظیم کی بنیاد ہندوؤں کے خوف پر ہے۔ یہ ہم نے اس لئے کہا تھا کہ مسلم لیگ اس امر پر سادہ لوح مسلمانوں کو بلاتی ہے ورنہ لیگ کے جو لوگ...... ہیں ان کی اصلی بات یہ ہے کہ ان کو صرف اپنی کرسیوں کے چھن جانے کا خوف ہے اس کے علاوہ انھیں کسی چیز کی پروا نہیں۔ اور مسٹر جناح نے آر۔ سی۔ بل کی تائید کی وجہ بیان کرتے ہوئے اسکو کھول دیا کہ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو پنجاب کی مسلم وزارت خطرہ میں پڑ جاتی۔ سبحان اللہ! انھوں نے پنجاب کی خلافت راشدہ کو خطرہ سے بچا لیا لیکن اللہ کی کتاب کو خطرہ میں اور لاکھوں بلکہ کروڑوں باایمان مسلمانوں کے ایمان کو آزمائش میں ڈال دیا اور اب یہ مستقبل فیصلہ کریگا کہ کون خطرہ میں ہے اور کون مامون! ہم یہ قیامت کا حوالہ نہیں دیتے، جس کے بارہ میں معلوم نہیں تمہارے مجتہدوں کی گواہی کیا ہو، اس دنیا کی عدالت کا حوالہ دیتے ہیں جس کے علم ہی پر تم قانع ہو مگر حال یہ ہے کہ اس سے بچے ہو اور شمشیر سے ٹھوکر کھاتے ہو۔

الاصلاح کا مسلک اور ہماری دعوت آجکل ہم سے خطوط آرہے ہیں کہ ہم لیگ سے مایوس ہو چکے اور کانگریس کو بھی دیکھ چکے اب بتاؤ کیا کریں؟ اور کہاں جائیں؟ معلوم ہوتا ہے یہ احباب شذرات کے صفحات غور سے نہیں پڑھتے۔ اس اشاعت میں تو موقع نکل گیا، انشاء اللہ آیندہ مفصل لکھوں گا۔ مگر تنبیہاً اجمالاً کہہ دینے میں کوئی حرج نہیں کہ مسلمانوں کی رہنما جماعت صرف جمعیۃ علما ہو سکتی ہے لیگ سراسر فتنہ ہے کانگریس ناگزیر ہے، اور جمعیۃ علما کی رہنمائی میں انشاء اللہ تمام خطرات سے مامون۔ اور الگ الگ گھروندے بنانے والوں سے الاصلاح کو سخت اختلاف ہے لیڈروں اور جماعتوں کی کثرت ہی ہماری تباہی کا اصلی سبب ہے۔

معارف قرآن

تفسیر سورۂ قیامہ

۵

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ

۱۴۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی حفاظت کا وعدہ اجمالاً اور تفصیلاً متعدد آیات میں فرمایا ہے۔

كِتَابٌ عَزِيزٌ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ	کتاب عزیز ہے، باطل نہ اس میں اس کے
بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ	آگے سے آسکتا نہ پیچھے سے۔

دوسری جگہ فرمایا:-

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ	بے شک ہم نے اتارا ہے ذکر کو اور ہم ہی
لَحَافِظُونَ	اس کی حفاظت کرنے والے ہیں

ان آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں کمی بیشی اور تبدیلی کا امکان نہیں ہے۔ کیونکہ یہ باتیں قرآن مجید کی حفاظت کے منافی ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید کے متعلق یہ امر مسلّم ہے کہ وہ پوری طرح محفوظ ہے نہ اس میں ایک نقطہ کا اضافہ ہوا، نہ ایک شوشہ کی کمی، اور شیعہ امامیہ کے نسبت مشہور ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید کا کچھ حصہ غائب کر دیا گیا تو یہ بات ان کے اکابر علما کی تصریحات کے بالکل خلاف ہے۔ سید مرتضیٰ، شیخ الطائفہ محمد بن حسن طوسی، ابو علی طبرسی صاحب مجمع البیان، محمد بن علی بن بابویہ قمی سب نے اس لغو خیال کی پوری شدت کے ساتھ تردید کی ہے۔ محمد بن علی بن بابویہ قمی کہتے ہیں: "ہمارا

اعتقاد ہے کہ جو قرآن اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا وہ وہی ہے جو ما بین الدفتین امت کے ہاتھوں میں موجود ہے۔ قرآن مجید اس سے زیادہ ایک حرف نہیں تھا۔ جو شخص ہماری طرف منسوب کرتا ہے کہ ہم قرآن مجید کے اس سے زیادہ ہونے کے قائل ہیں وہ جھوٹا ہے۔" اس بارہ میں ان کے ہاں جو روایات ہیں اس کے بارہ میں سید مرتضیٰ کہتے ہیں۔ "امامیہ اور حشویہ میں سے جن لوگوں نے اس بارہ میں اختلاف کیا ہے، ان کے اختلاف کی کوئی وقعت نہیں ہے، ان کے سارے اختلاف کا مدار اصحاب روایات کی چند ضعیف روایات پر ہے جن کو یہ صحیح سمجھتے ہیں، حالانکہ ان روایات کی یہ حیثیت نہیں ہے کہ ان کے اعتماد پر ایک ایسی بات سے انکار کر دیا جائے جس کی صحت قطعیت کے ساتھ معلوم ہے۔" سید مرتضیٰ نے اس پر دوسری دلیلیں بھی قائم کی ہیں لیکن یہاں ہم ان کی تفصیل میں نہیں پڑنا چاہتے۔ ہماری کتاب تاریخ القرآن میں تمام ضروری تفصیلات ملیں گی۔ یہاں ہم مسئلہ سے اسی حد تک تعرض کرنا چاہتے ہیں جتنا سورہ کے اس مقام کی توضیح کیلئے ضروری ہے۔

آیت "ان علینا جمعہ وقرانہ۔ فاذا قرأناہ فاتبع قرانہ۔ ثم ان علینا بیانہ" میں تین باتیں نہایت واضح طور پر نمایاں ہیں۔

(۱) قرآن آنحضرت صلعم کے عہد میں جمع ہو کر ایک خاص ترتیب سے آپ کو سنا دیا جائے گا۔ اگر یہ وعدہ آپ کی وفات کے بعد پورا ہونے والا ہوتا تو آپ کو اس قرأت کی پیروی کا حکم نہ دیا جاتا۔ فاذا قرأناہ فاتبع قرانہ۔

(۲) آپ کو حکم تھا کہ جمع قرآن کے بعد دوبارہ جس طرح آپ کو قرآن سنایا جائے اس طرح آپ پڑھیں اور یہ بات عقلاً اور نقلاً دونوں اعتبار سے غلط معلوم ہوتی ہے کہ آپ پر کوئی بات بطریق وحی آئے اور آپ اس کو امت کو نہ پہنچائیں۔ عقلاً تو اس کی غلطی بالبداہت واضح ہے۔ کسی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ نقلاً یوں غلط ہے کہ قرآن مجید میں فرمایا ہے۔

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ — اے رسول جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر اتارا گیا ہو

مِن رَّبِّكَ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا — اس کو پورا پورا پہنچا دو، اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو

بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ — تم نے (گویا) اس پیغام کو نہیں پہنچایا جو تم کو دیا گیا۔

یہ ایک عام حکم ہے اور اس حکم عام کا تقاضا ہے کہ آنحضرت صلعم نے امت کو اس ترتیب کے مطابق قرآن سنایا ہو جس ترتیب پر اس کی آخری قرأت ہوئی اور جو یقیناً لوح محفوظ کی ترتیب ہے کیونکہ آخری قرأت کا اصل کے ٹھیک ٹھیک مطابق ہونا ضروری ہے۔

(۳) تیسری بات یہ نکلتی ہے کہ اس جمع و ترتیب کے بعد اللہ تعالیٰ نے وہ باتیں بھی بیان فرما دیں جو تعمیم، تخصیص یا تخفیف و تکمیل سے تعلق رکھتی تھیں۔

یہ باتیں قرآن مجید سے ثابت ہیں اور ان کی تائید روایات سے ہوتی ہے کہ یہ تمام باتیں ٹھیک ٹھیک پوری ہوئیں۔ چنانچہ آنحضرت صلعم قرآن مجید کی پوری پوری سورتیں لوگوں کو سناتے تھے اور یہ بغیر اس کے ممکن نہیں کہ آپ کو وہ اس خاص ترتیب پر سنائی گئی ہوں، اور صحابہؓ اسی ترتیب کے مطابق قرآن مجید کو سنتے اور محفوظ کرتے تھے۔ نیز یہ بھی معلوم ہے کہ آپ خاص خاص آیتوں کو سورتوں میں خاص خاص مقامات میں لکھواتے تھے اور صحابہؓ اس کی پابندی فرماتے تھے۔ اور پھر جب کوئی تشریح کرنیوالی آیت اترتی تو آپ اس کو بھی قرآن مجید میں لکھواتے اور ان کے لکھوانے میں دو طریقے ملحوظ تھے یا تو وہ ان آیات کے ساتھ ملا دی جاتیں جن کی تشریح کرتیں۔ یا سورہ کے آخر میں رکھدی جاتیں اگر ان کا تعلق سورہ کے مجموعی مضمون سے ہوتا۔

ان تشریح کرنیوالی آیتوں کی ایک اور نمایاں علامت بھی قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ان میں خود اس طرح کے الفاظ موجود ہوتے ہیں جو واضح کرتے ہیں کہ یہ تشریح و بیان کیلئے نازل ہوئی ہیں مثلاً اس طرح کی آیات کے ساتھ اکثر فرمایا گیا ہے کذلک یبین اللہ آیاتہ للناس اسی طرح اللہ اپنی آیتوں کو لوگوں کے لئے کھول دیتا ہے

اس طرح جب قرآن نازل ہو چکا تو آخر میں حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ کو پورا قرآن اس کی اصلی ترتیب کے مطابق سنا دیا۔ یہ بات صحیح اور متفق علیہ روایات سے ثابت ہے اور اس سے نظم قرآن کی بیشمار مشکلات آپ سے آپ حل ہو جاتی ہیں۔ چونکہ یہ مسئلہ نہایت اہم تھا اس لئے ہم نے اپنی کتاب تاریخ القرآن میں اس پر تفصیل سے بحث کی ہے نیز مقدمۂ تفسیر میں بھی بعض ضروری امور کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔ اس لئے یہاں زیادہ پھیلانے کی ضرورت نہیں۔

۱۵۔ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا	کتنے چہرے اس دن تر و تازہ ہوں گے اپنے
نَاظِرَةٌ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ	پروردگار کی رحمت کے منتظر، اور کتنے چہرے اداس ہوں گے
تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ	گمان کریں گے کہ ان پر کمر توڑنے والی مصیبت ٹوٹے گی

یہ ماننے والوں اور جھٹلانے والوں کی تصویریں ہیں۔ اور دونوں کو ایک دوسرے کے مقابل میں رکھا ہے تاکہ ان کا فرق پوری طرح واضح ہو جائے۔ ایک گروہ تو وہ ہوگا جو رحمت الٰہی کی امیدوں سے ہشاش بشاش ہوگا۔ چہرے کھلے ہوئے ہوں گے، پیشانیاں چمکتی ہوں گی۔ اور دوسرا گروہ عذاب الٰہی کے اندیشہ سے بدحواس ہوگا، چہرے اترے ہوئے ہوں گے، پیشانیاں سمٹی ہوئی ہوں گی۔ بالکل اسی کے مماثل تصویر سورہ عبس میں نظر آتی ہے۔ وجوہ یومئذ مسفرۃ ضاحکۃ مستبشرۃ ووجوہ یومئذ علیہا غبرۃ ترہقہا قترۃ

اور خیال سے دیکھو۔ یہاں جس طرح انکار کرنیوالوں کی دو خصوصیتیں نمایاں کی ہیں۔ چہرہ کی اداسی اور بدگمانی۔ اسی طرح ماننے والوں کی بھی دو صفتیں بیان کی ہیں۔ چہرہ کی رونق اور بشاشت امید اور اہل نظر سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ یہ دوسری صفت درحقیقت پہلی صفت کا سبب ہے۔ خوشی ہو یا غم قلب پر جہاں ان کا اثر ہوا، فوراً ان کے آثار چہرہ پر نمایاں ہو جاتے ہیں۔ متمم بن نویرہ کا مصرع ہے

ولوعۃ حزن یترک الوجہ اسفعا

اس کی مثالیں بہت مل سکتی ہیں۔

"نظر" یہاں انتظار کے معنی میں ہے۔ قرآن مجید میں اس معنی میں یہ لفظ کئی جگہ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً قال سننظر اصدقت ام کنت من الکٰذبین۔ کہا ہم انتظار کریں گے کہ تم نے سچ کہا کہ جھوٹوں میں ہو۔ دوسری جگہ ہے۔ وانی مرسلۃ الیہم بہدیۃ فنٰظرۃ بم یرجع المرسلون۔ میں ان کے پاس ہدیے لیکے بھیجتی ہوں اور دیکھتی ہوں (انتظار کرتی ہوں) کہ قاصد کیا جواب لیکے لوٹتے ہیں۔

اس آیت میں "الیٰ ربہا ناظرۃ" سے رویت باری پر استدلال کیا گیا ہے۔ اور بعضوں نے اس کی تردید کرنی چاہی تو کہدیا کہ "الیٰ" "آلاء" کی واحد ہے جس کے معنی نعمت کے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ دونوں باتیں محض وہم اور لغت عرب اور اسالیب کلام سے بیخبری پر مبنی ہیں۔ "الیٰ" کے معنی نعمت کے نہیں آتے۔ ہم اپنی کتاب مفردات القرآن میں اس کی پوری تحقیق لکھ چکے ہیں۔ رہا اس آیت سے رویت باری پر استدلال تو جب ہم منزہ ذات باری پر ایمان رکھتے ہیں تو اس کی ذات میں خوض کا ہم کو کیا حق ہے؟ کیا اس طرح کا تعمق بربادی دین کے آثار و علائم میں سے نہیں ہے؟ اس کے متعلق بعض اشارات "ولن ترانی" اور "لا یدرکہ الابصار" کی تفسیر میں ملیں گے۔

۱۶۔ تظن ان یفعل بہا فاقرۃ ـــــ اس میں یفعل بصیغۂ مجہول سے اس نکتہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ عذاب کا سبب درحقیقت خود ہمارا نفس اور اس کی آلودگیاں ہیں، جیسا کہ نعمت کے متعلق معلوم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتی ہے۔ اور ہم اس کے لئے ہمیشہ اسی سے لو لگاتے ہیں۔ اس مضمون کو دوسرے مقام میں بالکل واضح کر دیا ہے۔

مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ	جو مصیبت تم کو پہنچتی ہے تو یہ خود تمھارے اپنے ہاتھوں کی کرتوت ہے
وَيَعْفُوْ عَنْ كَثِيْرٍ	اور اللہ تعالیٰ تمھاری بہت سی برائیوں سے درگذر فرماتا ہے۔

یہی اسلوب غیر المغضوب علیہم ولا الضالین میں ملحوظ ہے۔ اس میں غضب کو اپنی ذات کی طرف منسوب نہیں کیا حالانکہ انعمت علیہم میں نعمت کو اپنی طرف منسوب فرمایا۔ اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت عام ہے۔ وہ ہر بندہ پر انعام و احسان فرماتا ہے۔ باقی رہا اس کا غضب تو اس کے مستحق وہی لوگ ہوتے ہیں جو اپنی شرارتوں سے اس کے مستوجب ہو جائیں۔ اس کے خلاف کہیں کہیں جو غضب و انعام اور رحمت و نعمت کو اطلاق کے ساتھ اپنی ذات کی طرف منسوب فرمایا ہے تو اس سے اپنے عام عدل اور اپنے عام قانون کا بیان مقصود ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں قابل لحاظ حقیقت یہ ہے کہ بندہ اگر انسانیت کے اسفل ترین درجہ میں نہیں گر گیا ہے، تو معبود کی ذات اس کے لئے سراپا محبت و محبوبیت ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ اس سے رحمتوں اور برکتوں ہی کا امیدوار رہتا ہے اور ایسی ہی صفتوں اور ناموں سے اس کو پکارتا ہے جو اس کی رحمت اور کریمی کو ظاہر کرتے ہیں۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم کی تفسیر میں اس کے لطائف بیان ہوئے ہیں۔ یہاں اعادہ کی حاجت نہیں۔ پس اگر اس آیت کا مقابلہ اس آیت سے کرو جو اس سے اوپر مومنین کی تعریف میں گذر چکی ہے تو تم کو یہ بات معلوم ہوگی کہ مومن اور منکر کے حالات قیامت کے دن بالکل مختلف ہوں گے۔ مومن اللہ تعالیٰ کی قربت اور رحمت کا امیدوار ہوگا۔ اور منکر اس کی خوشنودی سے مایوس اپنے کو اس سے بہت دور پائے گا۔ کلا انہم عن ربہم یومئذ لمحجوبون۔

۱۷- بلغت التراقی۔ اس میں ضمیر نفس کے لئے ہے جو محذوف ہے۔ اس حذف کی مثال سورہ واقعہ میں بھی ہے۔ فلولا اذا بلغت الحلقوم۔ چونکہ اس قسم کا حذف عربی زبان میں معلوم و مشہور تھا اس لئے لفظ نفس کا ذکر ضروری نہیں ہوا۔ شعروں میں بھی اس کے شواہد موجود ہیں۔ حاتم طائی کا شعر ہے۔

اماوی ما یغنی الثراء عن الفتی　　اذا حشرجت یوما وضاق بہا الصدر

اے ماویہ مال نوجوان کے کیا کام آئے گا جبکہ جان سینہ میں گھٹنے لگے گی۔

اس میں حشرجت کا فاعل نفس ہے لیکن اسی عام قاعدہ کے مطابق جو اوپر بیان ہوا اس کو حذف کر دیا ہے۔ اس قسم کے حذف کی مثالیں قرآن مجید میں اور بھی موجود ہیں مثلاً ما ترک علی ظہرہا من دابۃ اور زمین کی پشت پر کوئی جاندار جیتا نہ چھوڑا۔

اس آیت میں قرأت کا بھی ایک اشکال ہے، اس کو وضاحت کے ساتھ سمجھ لینا چاہئے۔ علماء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ آنحضرت صلعم آیات کے آخر میں وقف فرماتے تھے یعنی ان کو آگے سے الگ کرکے تلاوت فرماتے تھے۔ اس کے لئے اہل فن کے یہاں اصطلاحی لفظ فاصلہ ہے۔ یہ فواصل کا معاملہ زیادہ تر صوت اور آہنگ کی یکسانی سے تعلق رکھتا ہے۔ معنی کے فصل و وصل سے اس کو لگاؤ نہیں ہے وہ ایک بالکل دوسری ہی چیز ہے۔ اشعار اور مسجع کلام میں اس کی مثالیں دیکھ کر تم اس کی تصدیق کر سکتے ہو۔ اب اس اصول کی روشنی میں جو بات بیان جاننے کی ہے وہ یہ ہے کہ اہل عرب کبھی ہی کو لفظ کے آخر سے حذف کر دیتے ہیں۔ بالخصوص یائے ساکن میں ان کا یہ ضابطہ بہت چلتا ہے۔ قرآن میں، بالخصوص فواصل کے اندر، اس کی مثالیں بہت مل سکتی ہیں۔ مثلاً لکم دینکم ولی دین۔ اس میں دین دراصل "دینی" ہے۔ لیکن مذکورہ قاعدہ کے مطابق ی حذف ہو گئی ہے۔ اشعار عرب میں تو قوافی کے علاوہ بھی اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ خنساء کے شعر ہیں۔

وتعذرت افق البلاد[1]　　فمابہا وشل لماتح

تذری السوافی علی السوا[2]　　م واجد بت سبل المشام

[1] اور تمام جگہوں کی راہیں بند ہو گئیں۔ اب ان میں طالبوں کے لئے کوئی امید باقی نہیں رہ گئی۔

[2] اب یہ اونٹوں (مال و متاع) پر خاک اڑاتی ہیں) اور جستجو والوں کے راستے قحط زدہ ہو گئے۔

سوافی سافیا کی جمع بھی ہے جس کے معنی غبار کے ہیں۔ قال ابو داؤد

وفنوی اضر بہ السافیاہ　　کدرس من النون حین امحی

پس تذری کا فاعل افق البلاد ہو سکتا ہے۔ تانیث مضاف الیہ کی رعایت سے ہوگی۔ (مترجم)

اس میں سوانیؔ کے آخر سے ی حذف ہو گئی حالانکہ یہ تراقی کی طرح حالت نصب میں ہے۔

خنساء ہی کا دوسرا شعر ہے۔

فیا عین بکی لامری طار ذکرہ له بکی عین الراکضات السوابح

اس میں بکی کی ی حذف ہو گئی ہے۔

سیبویہ نے اپنی کتاب میں مندرجہ ذیل مثال پیش کی ہے۔

فطرت بمنصلی فی یعملات دوامی الاید یخبطن السریحا

اس میں لفظ "ایدی" کی ی حذف ہے۔

الغرض چونکہ عربی زبان میں یائے ساکن کو حذف کر دینے کا قاعدہ موجود تھا اور "تراقی" کی ی بحالت وقف ساکن تھی اس لئے یہ بات جائز ہوئی کہ ی حذف کر دی جائے، پھر ق کو ساکن پڑھا جائے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً ولی دین کہ دراصل دینی تھا فبشر عباد کہ اصل میں عبادی ہے۔ لما یذوقوا عذاب کہ فی الاصل عذابی ہے

(باقی)

تفسیر سورہ کافرون

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ کی تفسیر سورہ کافرون کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں ہجرت اور برأت کا اصل فلسفہ بیان کیا گیا ہے اور نبوت کے مراحل و مقامات کی توضیح اس قدر حکیمانہ انداز میں کی گئی ہے کہ قرآن مجید کی بے شمار مشکلات آپ سے آپ حل ہو گئی ہیں۔ کتابت و طباعت بہترین، کاغذ عمدہ، تقطیع ۲۰×۲۶/۱۶ حجم ۴۰ صفحے۔ قیمت [illegible]

"منیجر"

له، اے آنکھ اس شخص پر آنسو بہا جو شہرہ آفاق تھا اور جس کے غم میں صبا رفتار گھوڑے بھی روتے ہیں۔ (مترجم)

ذبیح کون ہے؟

(۹)

دسویں دلیل

ذبیح اور حضرت اسحٰقؑ کا ذکر مستقلاً علیحدہ علیحدہ ہوا ہے

۳۹۔ اوپر تم نے دیکھا کہ پہلے اس مُبشَّر کا ذکر ہوا جس کو ذبیح ہونے کی عزت و سعادت حاصل ہوئی۔ پھر اس مُبشَّر کا ذکر ہوا جس کا نام تصریح کے ساتھ اسحٰق بتایا گیا۔ اب دیکھو کہ ان دونوں کے حالات مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان ہوئے۔

وَبَارَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلَىٰ إِسْحَاقَ ۚ وَمِن — اور ہم نے اس پر برکت دی اور اسحاق پر، ان دونوں کی

ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ مُبِينٌ — اولاد میں نیکوکار بھی ہیں اور اپنی جان پر کھلا ہوا ظلم کرنے والے بھی

آیت کے الفاظ پر غور کرو۔ یہاں بھی دونوں کو دو شخص علیحدہ علیحدہ قرار دیا ہے۔ ایک نہیں قرار دیا۔

پس جب یہ بات ثابت کہ پہلی بشارت دوسری بشارت سے بالکل علیحدہ ہے، اور یہ طے کہ ذبیح وہ بیٹا ہوا جو پہلی بشارت کا مصداق ہے اور دوسری بشارت کے متعلق تصریحات سے معلوم کہ اس کا تعلق حضرت اسحٰقؑ سے ہے تو اب ہمارے دعوی کے ثبوت میں کس چیز کی کمی رہ گئی؟ انہی نتائج تک تو ہم پہنچنا چاہتے تھے!

ہاں! اب صرف یہ بات رہ گئی کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہاں جن دو شخصوں کا ذکر ہے ان سے مراد حضرت ابراہیم اور حضرت اسحٰق علیہما السلام ہیں۔ آیت میں حضرت اسمٰعیلؑ کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک بوجوہ ذیل یہ تاویل نہایت کمزور ہے۔

الف۔ حضرت ابراہیمؑ پر برکت کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ۝ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ

سلامتی ہو ابراہیم پر، ایسے ہی ہم بدلہ دیتے ہیں نیکوکاروں کو۔ بے شک وہ ہمارے باایمان بندوں میں سے تھا۔

اور اس جملہ کا اسلوب بالکل ایک اختتامی جملہ کا اسلوب ہے۔ یعنی اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان سے متعلق جو بات بیان کرنے کی تھی، پوری ہو گئی۔ اب کوئی اور تفصیل باقی نہیں رہ گئی ہے۔ چنانچہ یہاں آگے اور پیچھے جتنے انبیاء کا ذکر ہوا ہے ان سب کا ذکر اسی طرح کے جملہ سے پورا ہوا ہے۔ مثالیں دیکھو، فرمایا:

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝ سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ ۝ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ۝ وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ (والصّٰفّٰت)

اور چھوڑا ہم نے اس پر پچھلوں میں۔ سلامتی ہو نوح پر عالم میں۔ ایسے ہی ہم بدلہ دیتے ہیں نیکوکاروں کو۔ بے شک وہ ہمارے باایمان بندوں میں سے تھا۔ پھر ہم نے غرق کر دیا اوروں کو اور بے شک اس کی جماعت میں سے تھا ابراہیم۔

پھر فرمایا:

سَلٰمٌ عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۝ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَاِنَّ اِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ

سلامتی ہو موسیٰ اور ہارون پر، ایسے ہی ہم بدلہ دیتے ہیں نیکوکاروں کو۔ بے شک وہ دونوں ہمارے باایمان بندوں میں سے تھے اور بے شک الیاس رسولوں میں سے تھا۔

پھر فرمایا:

سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ يَاسِيْنَ ۝ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَاِنَّ لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ

سلامتی ہو الیاس پر۔ بے شک ایسے ہی ہم بدلہ دیتے ہیں نیکوکاروں کو۔ بے شک وہ ہمارے باایمان بندوں میں سے تھا اور بے شک لوط رسولوں میں سے تھا۔

پھر سورہ کا خاتمہ اس آیت پر فرمایا

سَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۝ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

اور سلامتی ہو رسولوں پر اور شکر ہے عالم کے پروردگار کے لئے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ سے فارغ ہونے کے بعد برکت و سلامتی کے ساتھ ان کے ذکر کو تمام کر دیا ہے۔ پھر اس برکت و سلامتی کا ذکر فرمایا جو ان کی ذریت کے لئے مخصوص ہوئی اور چونکہ حضرت ابراہیمؑ کے واقعہ کے سلسلہ میں ان کے پہلے بیٹے کی بشارت کا ذکر ہو چکا تھا اس لئے اس کے بعد ان کے دوسرے بیٹے کی بشارت کا ذکر ہوا، پھر تمام انبیاء کے ذکر کی طرح برکت و سلامتی کے ذکر کے ساتھ ان کے ذکر کو بھی ختم کر دیا۔

ب۔ یہ بات اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت اسحٰقؑ دونوں کو برکت عطا فرمائی اور ان کی اولادوں کو دو مبارک جگہوں میں علیحدہ علیحدہ بسایا۔ نیز یہ بھی معلوم ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کے مسکن کے لئے برکت کی دعا فرمائی۔ تورات میں حضرت اسمٰعیلؑ کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے برکت پانا تصریح کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ یہ وجوہ داعی تھے کہ یہاں ان دونوں کی برکت کا ذکر آئے۔

پس جب تک اس بات کی کوئی نہایت قوی دلیل نہ مل جائے کہ یہاں تخصیص کے ساتھ صرف حضرت اسحٰقؑ کا ذکر ہوا ہے، اس وقت تک اس ظاہر حقیقت کو نظرانداز کرنا ناممکن ہے اور چونکہ اس طرح کی کوئی دلیل یہاں موجود نہیں ہے اس لئے اولیٰ یہی ہے کہ ہم وہ تاویل اختیار کریں جو زیادہ صحیح اور زیادہ خوبصورت ہو۔ یعنی یہ سمجھیں کہ یہاں حضرت اسحٰقؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ دونوں کے لئے برکت و سلامتی کا ذکر ہے۔ گویا پوری بات یوں کہی گئی ہے کہ ہم نے اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ پر اپنی رحمت و برکت نازل کی اور ان دونوں کی اولاد میں سے کچھ نیکوکار ہیں اور کچھ اپنے آپ پر کھلے ہوئے ظلم کرنے والے ہیں۔

ج - اللہ تعالیٰ نے، اپنے نیک بندوں پر اپنے انعامات کا ذکر قرآن مجید میں بار بار فرمایا ہے۔ اور ان نیک بندوں میں سے جن لوگوں کو اپنے مخصوص فضل و کرم سے نوازا، ان کا ذکر مخصوص اہتمام سے فرمایا۔ اسی مخصوص جماعت میں حضرت اسمٰعیل و حضرت اسحٰق علیہما السلام ہیں جو خاص فضل و برکت سے مشرف ہوئے، پس قرآن مجید اور تورات میں ان کی برکتوں اور نعمتوں کا ذکر بار بار خاص اہتمام کے ساتھ ہوا تاکہ عرب اور یہود جو ان کی ذریت میں ہیں، اداے شکر کی اس ذمہ داری کو سمجھیں جو ان نعمتوں کے بعد ان پر عائد ہوتی ہے۔ کلام کے اس رجحان کے لحاظ سے یہاں یہ ضروری ہوا کہ یہ امر بھی بیان کر دیا جائے کہ ان کی ذریت دو جماعتوں میں بٹ گئی، ایک جماعت نے نیکی و اطاعت کی راہ اختیار کی اور اپنے پروردگار کی شکر گذار ہوئی اور دوسری جماعت نافرمانی اور شرارت کی وادیوں میں بھٹک گئی اور اپنے آپ پر ظلم کیا۔ اور اس تفصیل کا مقصد یہ تھا کہ ان لوگوں کو تنبہ ہو اور یہ خدا کی نعمتوں کو جو ان پر اور ان کے آباو اجداد پر ہوئیں یاد کر کے اطاعت و شکر گذاری کی راہ اختیار کریں۔

قرآن مجید اور تورات میں یہ مضمون بار بار بیان ہوا ہے جس سے مذکورہ تفصیل کی پوری تائید ہوتی ہے۔ مثلاً

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِيْمَ وَ	اور بھیجا ہم نے نوحؑ اور ابراہیمؑ کو اور ٹھہرائی ان کی
جَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ	ذریت میں نبوت اور وحی کتاب، پس ان میں کوئی
فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ	ہدایت پر ہیں اور زیادہ نافرمان ہیں۔

دوسری جگہ ہے۔

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا	پھر ہم نے وارث بنایا کتاب کا ان لوگوں کو جن کو چن لیا اپنے بندوں
مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ	میں سے پس ان میں کچھ اپنی جان پر ظلم کرنے والے ہیں
مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرٰتِ	کچھ میانہ رو ہیں کچھ بھلائی میں بڑھنے والے ہیں۔

پس اسی طریق پر یہاں عرب اور یہود دونوں کو ان خرابیوں پر متنبہ کیا ہے جو ان کے اندر پیدا ہو گئی ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل اس باب کے آخر میں ہم کسی قدر بیان کریں گے۔ غرض ومن ذریتھما محسن وظالم لنفسہ مبین (اور ان کی ذریت میں کچھ نیکوکار اور کچھ اپنے نفس پر کھلے ہوئے ظلم کرنے والے ہیں) کا ظاہر مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس سے حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت اسحٰقؑ دونوں کی ذریات مراد ہوں کیونکہ کچھ کا نیکوکار، اور کچھ کا ظالم ہونا جس طرح حضرت اسحٰقؑ کی ذریت کے باب میں صحیح اور بالکل واقعات کے مطابق ہے اسی طرح حضرت اسمٰعیل کی ذریت کے بارہ میں بھی حرف حرف صحیح اور نفس واقعہ کی صحیح تصویر ہے اور قرآن مجید جوامع الکلم کی بہترین مثال ہے۔ ناممکن ہے کہ اس کا کوئی بیان ادھورا اور ناقص ہو۔ اس کا طرز بیان ہمیشہ جامع اور تمام اطراف و جوانب کو سمیٹنے والا ہوتا ہے۔ اگر ومن ذریتھما (اور ان دونوں کی ذریت) میں ضمیر کا مرجع حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسحٰقؑ کو قرار دیا جائے تو یہ خوبصورت، جامع، اور صحیح تاویل بالکل درہم برہم ہو جاتی ہے اور کوئی دوسری لائق قبول تاویل سامنے نہیں آتی۔ کیونکہ اس صورت میں دو ہی شکلیں ممکن ہیں، یا تو ذریت سے تم ایک ذریت مراد لو گے۔ یعنی وہ ذریت جو حضرت ابراہیم اور حضرت اسحٰق علیہما السلام کے درمیان مشترک ہے، جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ نے بنی اسمٰعیلؑ کے لئے اپنی دعا میں مراد لیا ہے۔

وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ	اور ہماری ذریت میں سے اپنی ایک فرمانبردار امت بنا

یہاں "ہماری ذریت" کے الفاظ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی ذریت کو مراد لیا ہے کیونکہ وہ حقیقت کے اعتبار سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذریت بھی تھی۔ پس اس مفہوم کے اعتبار سے ومن ذریتھما میں جو بات بیان کی گئی ہے وہ صرف حضرت اسحٰقؑ کی ذریت کے لئے مخصوص ہو جائے گی اور جو معنی مقصود ہے وہ کسی طرح ادا نہ ہو سکے گا بلکہ معاملہ کا اصلی قابل ذکر حصہ جو موقع کے اعتبار سے واقعی اہمیت رکھتا ہے، بالکل جاتا رہے گا۔

یا دو ذریتیں مراد لو گے۔ پہلی حضرت اسحٰقؑ کی خاص ذریت، یعنی حضرت یعقوب اور ان کی نسل، عیص اور ان کی نسل اور دوسری حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خاص ذریت جس کو اولین درجہ میں ان کی ذریت ہونے کی عزت حاصل ہے یعنی خود حضرت اسمٰعیل و حضرت اسحٰق علیہما السلام۔ اس صورت میں تمہاری تاویل کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتی کیونکہ حضرت ابراہیمؑ کی خاص ذریت میں کوئی بھی نہیں ہے جو ظالم لنفسہ کا مصداق ہو سکے۔ اب صرف ایک ہی شکل رہ گئی ہے کہ حضرت اسمٰعیل اور حضرت اسحٰق علیہما السلام کی ذریت کو مراد لو اور یہ کہو کہ حضرت اسمٰعیل کی ذریت کو یہاں ذریت ابراہیم سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک اس ایچ پیچ کی ضرورت نہیں ہے۔ اس مفہوم کو ظاہر کرنے کے لئے سب سے زیادہ آسان راہ یہ ہے کہ ضمیر کا مرجع حضرت اسمٰعیل کو قرار دیا جائے جن کا ذکر اوپر ہوا ہے اور حضرت اسحٰق کو قرار دیا جائے جن کا ذکر بعد میں آیا ہے اور پھر ان دونوں کا ذکر بارکنا علیہ وعلی اسحٰق میں ہو چکا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ پس اس تکلف کی مطلق ضرورت باقی نہیں رہتی کہ ذریت اسمٰعیل کو ذریت ابراہیم کے لفظ سے تعبیر کیا جائے یہ ایک صحیح نتیجہ تک غلط راہ سے پہنچنے کی کوشش ہے جو کسی طرح بھی محمود نہیں ہو سکتی۔ ہم جو بات کہتے ہیں وہ کلام کی ترکیب اور تاویل کے حسن و جامعیت کے اعتبار سے نہایت صاف ہے اس کے واضح ہو جانے کے بعد فضول تکلفات کی مطلق ضرورت نہیں رہی۔

(باقی)

ہدایت کا مفہوم اور اس کے اقسام

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ

اقتباس از بدائع الفوائد حافظ ابن قیم رحمہ اللہ

از مولوی حافظ عبد الاحد صاحب اصلاحی

علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے "اھدنا الصراط المستقیم" کی تفسیر کرتے ہوئے ہدایت کے مفہوم اور اس کے اطراف و جوانب پر نہایت جامعیت کے ساتھ بحث کی ہے۔ ذیل میں اس مضمون کے بعض ضروری حصوں کی تلخیص پیش کی جاتی ہے۔

ہدایت کی چار قسمیں

۱۔ ہدایت کی پہلی قسم وہ ہے جو تمام کائنات کے اندر، عام اور مشترک ہے

اَلَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (طٰہٰ) — وہ جس نے ہر مخلوق کو ایک خاص طرح کی بناوٹ عطا فرمائی پھر اس کو اس کے اغراض پورا کرنے کی راہ دکھائی۔

یعنی قدرت نے جتنی چیزیں پیدا کیں، عام اس سے کہ وہ حیوانات ہوں یا جمادات و نباتات، ان کو الگ الگ پیکر، علیحدہ علیحدہ صورت اور جدا جدا جسم و جثے عطا کئے جس سے وہ باہم دگر ممتاز اور نمایاں نظر آتی ہیں پھر ان کے ہر ہر عضو کو خاص خاص ہیئت بخشی، اور ہر ایک کے لئے ایک مخصوص وظیفہ (ڈیوٹی) متعین کیا اور اس کے سرانجام کے لئے اس کے اندر قوت رکھی۔ غرض دنیا کے اندر جتنے بھی وجود ہیں ان کی ایک

مخصوص فطرت ان کا ایک خاص انداز زندگی اور ان کے متعین مقاصد حیات ہیں اور ان مقاصد کے حصول کی طاقت اور تدبیریں ان کی فطرت میں ودیعت کر دی گئی ہیں۔ جانداروں کے اندر جو جبلتیں اور گر برائے حصول منفعت اور دفع مضرت کی ہم دیکھتے ہیں وہ کیا ہیں؟ یہ ان کی ہدایت فطرت ہی ہے یہی حال جمادات کا ہے وہ بھی اس ہدایت فطرت کی نگرانی میں پوری خاموشی کے ساتھ اپنے فرائض کی ادائگی میں مشغول ہیں۔ پھر جس طرح ان مختلف الخلقت جانداروں کے اندر ان کے مناسب حال ہدایت کارفرما ہے، اسی طرح ان کے مختلف اعضاء کے اندر ان اعضاء کے حسب حال ہدایت موجود ہے۔ پاؤں چلتے ہیں، ہاتھ پکڑتے ہیں، کان سنتے ہیں، آنکھیں دیکھتی ہیں، اسی طرح تمام اعضاء سے مخصوص مخصوص افعال متعلق ہیں اور وہ اپنے اپنے فرائض کو پوری مستعدی سے انجام دیتے ہیں۔ اگر یہ اعضاء چاہیں کہ اپنے متعلقہ فرائض کے علاوہ کوئی دوسرا کام انجام دیں تو نہیں کر سکتے۔ ہم ہاتھوں سے چلنا اور زبان سے سننا اور دیکھنا چاہیں تو ناممکن ہے۔ اس ہدایت کی ہمہ گیری کا اندازہ کرنا ہو تو ایک قدم اور آگے بڑھو۔ نر و مادہ کو دیکھو ان میں توالد و تناسل کے لئے ایک خاص طرح کا صنفی میلان اور اس کے لئے حرکت و عمل کا ایک باقاعدہ نظام کتنی خوبصورتی کے ساتھ موجود ہے۔ پھر ان کے اندر بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال کا ایک مخصوص طریقہ پایا جاتا ہے جو بغیر کسی تعلیم و تعلم کے ان کے اندر موجود ہے۔ انسان کے بچہ کو دیکھو جو ابھی ابھی پیدا ہوا ہے وہ کس طرح ماں کی پستان منہ میں لیکر چوستا ہے اور جب جب اسکو بھوک لگتی ہے تو ماں کی چھاتی ہی کو ڈھونڈتا ہے۔ اس کو کس نے بتایا کہ اس کی غذا کا سرچشمہ ماں کی چھاتی ہے؟ فطرت کی وہی عام ہدایت جس کی طرف مذکورہ بالا آیت میں قرآن نے اشارہ فرمایا ہے۔ انسان کو چھوڑو جو عقل و دانش کے اعتبار سے سب سے برتر مخلوق ہے۔ کسی ادنیٰ سے ادنیٰ مخلوق کے حالات پر غور کرو، شہد کی مکھیوں کو دیکھو ان کے اندر ہدایت فطرت کا کیسا معجزانہ ظہور پاتے ہو۔ وہ اس ہدایت کی روشنی میں پہاڑوں کے اندر، درختوں کی جڑوں میں، اور عمارتوں کی دیواروں اور محرابوں پر اپنے لئے کیسے کیسے خوشنما

بناتی ہیں، ان کے گھر صنعتگری اور استحکام کے کیسے حیرت انگیز نمونے ہوتے ہیں؟ وہ اپنے سردار کی اس طرح اطاعت کرتی ہیں جس طرح جماعت اپنے لیڈر کی اطاعت کرتی ہے۔ وہ جہاں کہیں جاتا ہے اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہیں۔ وہ پھول پھول اور پتی پتی پر بیٹھتی ہیں اور ہر پھر کے پھر اپنے اپنے گھروں میں پہنچ جاتی ہیں۔

جو شخص ان حالات پر تأمل کرتا ہے وہ بے تحاشا پکار اٹھتا ہے کہ لا الہ الا ھو عالم الغیب والشھادۃ العزیز الحکیم اور پھر یہیں سے اس کا ذہن نبوت کے اثبات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ جس ذات نے حیوانات تک کو اپنی ہدایت و رہنمائی سے محروم نہیں فرمایا۔ کیونکر ہو سکتا ہے کہ نوع انسانی کو جو خلاصہ کائنات اور تمام مجد و شرف کی حامل ہے بیکار اور بے مقصد بنائے اور حصول کمال اور اکتساب سعادت کی راہیں اس پر نہ کھولے۔ یہ بات بداہۃً حکمت الٰہی کے خلاف اور اس کی قدوسیت کے منافی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید نے ان لوگوں کے خیالات پر نہایت سختی کے ساتھ نکیر کی جو انسان کی خلقت کو بالکل بے نتیجہ اور بے مقصد سمجھتے ہیں۔

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ فَتَعَالَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ (مومنون)	تم خیال کرتے ہو کہ ہم نے تم کو یونہی بیکار پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم کو ہماری طرف پھر لوٹ کر آنا نہیں، تو خدا جو بادشاہ حق ہے وہ بے فائدہ کام کرنے سے بری اور بالاتر ہے۔

اس آیت میں معاد کا اثبات ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ فطرت سلیم اور عقل صحیح اس بات کے قبول کرنے سے انکار کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو یونہی غیر مسئول اور مطلق العنان چھوڑ دے۔ نہ اس کو عقل و ہدایت بخشے اور نہ عقل و ہدایت بخشنے کے بعد اس کے خیر و شر پر اس سے کوئی محاسبہ کرے۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کی صفات حکمت و علم کے بالکل منافی ہے اور ایک لمحہ کے لئے بھی جائز نہیں کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے متعلق اس طرح کا گمان رکھے۔

سماء کے بیشمار عقلی دلائل میں سے ایک دلیل ہے اور جو شخص اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھے گا اسکو یہ سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے گی کہ آیت

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُمْ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يُحْشَرُونَ

اور جتنے حیوانات زمین میں رینگتے پھرتے ہیں اور جتنے پرند اپنے دونوں پروں سے اڑتے پھرتے ہیں یہ سب تمہاری ہی طرح امتیں ہیں۔ ہم نے کتاب میں ...... کوئی کمی نہیں کی ہے پھر قیامت کے دن یہ سب اپنے پروردگار کے حضور

کا نظم وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ قُلْ إِنَّ اللَّهَ قَادِرٌ عَلَىٰ أَنْ يُنَزِّلَ آيَةً وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (اور کہتے ہیں اس پر اس کے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری جاتی۔ کہہ دو اللہ کوئی نشانی اتارنے پر قادر ہے لیکن اکثر نہیں جانتے) سے کیا ہے؟ اور مذکورہ بالا آیت اس آیت کے سوال کے جواب میں کیونکر موزوں ہوئی۔ کیونکہ جس شخص کے ذہن میں ہماری تقریر ہوگی وہ یہ بات بآسانی سمجھ جائے گا کہ یہاں رجحان کلام اثبات نبوت کی طرف ہے کہ جس پروردگار نے زمین کے چرند و پرند کو بھی اپنی ہدایت و رہنمائی اور تربیت و نگہداشت سے محروم نہیں فرمایا۔ بلکہ ان کے تمام مصالح و فوائد ان کی فطرت کے اندر ودیعت فرمائے تو کیسے ممکن ہے کہ وہ انسان کے مفاسد و مصالح سے بے پروا ہو جائے اور اس پر اس کے عروج و کمال کی راہیں نہ کھولے۔ یہ بات بالبداہت عقل کے خلاف ہے۔

یہ ہدایت کی پہلی قسم ہوئی جو سب سے زیادہ عام اور ہمہ گیر ہے۔

۲۔ ہدایت کی دوسری قسم بیان و تشریح کی ہدایت ہے یعنی وہ جو اللہ تعالیٰ نے نیکی و بدی کی تشریح اور نجات و ہلاکت کے راستوں کی تعیین کے لئے نازل فرمائی۔ اس ہدایت کے لئے لازم نہیں کہ اس کے بعد پوری پوری ہدایت وجود میں آجائے۔ اس کی حیثیت محض سبب اور شرط کی ہے۔ موجب کی نہیں ہے۔ اس لئے خود اس کے ساتھ ہدایت کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

وَأَمَّا ثَمُودُ فَهَدَيْنَاهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمَىٰ عَلَى الْهُدَىٰ

اور رہے ثمود تو ہم نے ان کو سیدھا راستہ دکھایا مگر انھوں نے سیدھا راستہ چھوڑ کر گمراہی اختیار کی

یعنی ہم نے اچھی طرح کھول دیا، پوری پوری رہنمائی کر دی مگر انھوں نے ہدایت کی راہ نہیں پکڑی۔ یہی ہدایت اس آیت میں بھی ہے۔

وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ

اے پیغمبر اس میں شک نہیں کہ تم لوگوں کو سیدھا راستہ دکھاتے ہو

۳۔ ہدایت کی تیسری قسم توفیق و الہام کی ہدایت ہے۔ اور یہ ہدایت قبول ہدایت کو مستلزم ہے جس شخص کو یہ ہدایت ملتی ہے وہ اس سے کسی حال میں منحرف نہیں ہو سکتا۔ آیات ذیل میں اسی ہدایت کا ذکر ہے۔

إِنْ تَحْرِصْ عَلَىٰ هُدَاهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ يُضِلُّ (نحل، ۳)

اگر تم ان کی ہدایت کی طمع کرو تو اللہ نہیں ہدایت دے گا جس کو اس نے گمراہ کر دیا۔

يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ (فاطر)

اور اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے جسکو چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھاتا ہے

آنحضور کا ارشاد ہے

مَنْ يَهْدِهِ اللَّهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهُ

اللہ تعالیٰ جسکو سیدھا رستہ دکھائے اسکو کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جسکو گمراہ کر دے اسکو کوئی سیدھا راستہ نہیں دکھا سکتا

قرآن میں ہے۔

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ (قصص)

اے پیغمبر تم جس کو چاہو ہدایت نہیں دے سکتے۔

یہاں پیغمبر کے لئے جس ہدایت کی نفی کی گئی ہے وہ یہی توفیق و الہام کی ہی ہدایت ہے باقی تبیین اور دعوت کی ہدایت تو وہ پیغمبر کے لئے ثابت ہے۔ جیسا کہ فرمایا۔

وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ

اے پیغمبر اس میں شک نہیں کہ تم لوگوں کو سیدھا راستہ دکھاتے ہو۔

۴۔ ہدایت کی چوتھی قسم اصل منزل یعنی جنت و دوزخ کی ہدایت ہے۔ آیت ذیل میں اسی ہدایت کا ذکر ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ يَهْدِيهِمْ	جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل بھی کئے ان کے
رَبُّهُم بِإِيمَانِهِمْ تَجْرِي مِن تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ فِي جَنَّاتِ	ایمان کی برکت سے ان کو ان کا پروردگار ہدایت دیگا۔ ان کے
النَّعِيمِ (یونس)	نیچے نہریں جاری ہوں گی آسائش کے باغ میں۔

اہل جنت، جنت میں پہنچکر پکاریں گے۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي هَدَانَا لِهَٰذَا (اعراف)	اس خدا کا شکر جس نے ہم کو اس کی ہدایت کی
احْشُرُوا الَّذِينَ ظَلَمُوا وَأَزْوَاجَهُمْ	جو لوگ (دنیا میں) نافرمانیاں کرتے رہے ہیں ان کو اور ان کے
وَمَا كَانُوا يَعْبُدُونَ مِن دُونِ	ساتھیوں کو اور خدا کے سوا جن (معبودوں) کو پوجتے رہے ہیں
اللَّهِ فَاهْدُوهُمْ إِلَىٰ صِرَاطِ الْجَحِيمِ	ان کو سب کو ایک جگہ اکٹھا کرو اور پھر ان کو دوزخ کے رستہ پر لے چلو۔

ان توضیحات کے بعد اب سوال یہ ہے کہ "اهدنا الصراط المستقیم" میں بندے کو جس ہدایت کی طلب و جستجو ہے وہ ان مذکورہ بالا ہدایتوں میں سے کونسی ہدایت ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بیان و ارشاد اور توفیق و الہام کی ہدایت۔ یعنی دوسری اور تیسری قسم کی ہدایت۔ بعض لوگوں کو یہ بات کھٹکی ہے کہ یہ دونوں ہدایتیں تو ایک مومن کو حاصل ہیں پھر جو چیز حاصل ہے اس کو طلب کرنیکے کیا معنی؟ بعضوں نے اس کا جواب یہ دیا کہ یہ طلب ثابت قدمی اور دوام ہدایت کے لئے ہوتی ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ جواب کسی اصول پر مبنی نہیں ہے۔ اس کا صحیح جواب اس سے زیادہ واضح اور اطمینان بخش ہے۔ بندہ کو یہ مطلوبہ ہدایت کامل درجہ میں اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب وہ مندرجہ ذیل چھ باتوں کا پورا پورا اہتمام کرے۔

اس امر کی صحیح معرفت کہ تمام مامورات الٰہی جن کو اس نے اختیار کیا ہے خدا کو محبوب و پسند ہیں اور تمام منہیات جن سے اس نے اجتناب کیا ہے خدا کے نزدیک نہایت مبغوض اور ناپسندیدہ ہیں۔

انسان کی اس معرفت میں جتنی ہی کمی ہوگی اتنا ہی وہ کامل ہدایت میں ناقص ہوگا۔

۲۔ وہ جس امر الٰہی کا ارادہ کرے پورے عزم کے ساتھ اس کا ارادہ کرے اور جس نہی سے بچنے کا ارادہ کرے تو پوری عزیمت کے ساتھ بچنے کا ارادہ کرے۔ اس عزیمت میں جتنا نقص ہوگا اتنا ہی وہ کامل ہدایت میں ناقص ہوگا۔

۳۔ وہ ہر ترک و فعل میں خدا کی ذات سے وابستہ رہے۔ اس چیز میں جتنی کمی ہوگی اتنا ہی وہ کامل ہدایت سے دور ہوگا۔ یہ تینوں چیزیں بمنزلہ اصل و بنیاد کے ہیں۔ ان کے علاوہ تین چیزیں اور ہیں جو بطور متممات کے ہیں۔

۱۔ بندہ جن باتوں کو اجمالاً جانتا ہے ان کو تفصیلاً جاننے کا محتاج ہے۔

۲۔ بہت سی باتوں کی ہدایت اس کو صرف بعض پہلوؤں سے حاصل ہے ان میں وہ تمام اطراف و اطراف جوانب سے رہنمائی کا طالب ہے۔

۳۔ جن امور میں تفصیلی ہدایت حاصل ہے ان میں دوام ہدایت مطلوب ہے،

یہ سب چھ اصول ہوئے۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ ہدایت کامل تک پہنچنے کے لئے بہت سے زینے اور منزلیں ہیں تو نہ یہ اعتراض صحیح ہے کہ طلب ہدایت تحصیل حاصل ہے اور نہ اس جواب کی ضرورت ہے کہ طلب ہدایت سے مقصد ہدایت پر ثبات و دوام حاصل کرنا ہے۔ یہ اس وقت صحیح ہوگا جبکہ مذکورہ بالا مراتب ستہ حاصل ہوں۔ اور ہمارا حال یہ ہے کہ اس راہ میں جتنا اور جو کچھ ہم کو حاصل ہے اس سے کئی گنے سے ہم محروم ہیں۔ پس ہم خداوند تعالیٰ سے جو ہدایت چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہمیں وہ اپنی توفیق سے اپنی مرضی کے جاننے کا علم، اور اپنی رضا جوئی اور خوشنودی کی طلب کا ولولہ دے۔

مذاکرہ

بلاغ الحق

(۶)

از جناب مولوی حافظ سید محمد ظفر اشرف صاحب المحتوی

اتحادِ عمل اور قربانی آخر میں مصنف نے سلسلہ معاملات مسلمانوں کو بہت سی نصیحتیں کی ہیں جن میں بعض باتیں قابل توجہ ہیں لیکن میں نظر انداز کرتا ہوں، البتہ اتحاد عمل کے ذیل میں انھوں نے گائے کی قربانی کے بابت جو کچھ لکھا ہے نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ جناب مصنف کے خیال میں "اسی قصہ نے تبلیغ و اشاعت اسلام کی راہ ماری ہے، اور اگر گائے کی قربانی بند کر دی جائے، تو اشاعت اسلام کے لئے خوشگوار فضا اور نتیجہ خیز ماحول پیدا ہو سکتا ہے۔"

جناب مصنف کی اس رفعت خیال اور بلند پروازی کی داد کہاں تک دی جائے اور کس طرح دی جائے کہ انھوں نے تبلیغ و اشاعت اسلام کے لئے ایسا بہترین، سہل الحصول اور اکسیری نسخہ ایجاد فرمایا لیکن سوال یہ ہے کہ اشاعت اسلام کی راہ تو گاؤکشی نے ماری ہے، لیکن تبلیغ عیسائیت میں یہی چیز کیوں مانع نہیں۔ آخر انگریزوں کے یہاں بھی تو گائے کٹتی ہے اور مسلمانوں سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں۔ مگر عیسائی مشنری اپنے کام میں مصروف ہیں، اور اپنی کامیابی پر نازاں اور خوش، آپ نے تبلیغ و اشاعت کا کام ہی کب کیا اور کہاں کیا، جو آپ کو معلوم ہو گیا کہ اشاعت اسلام کی راہ میں یہی گاؤکشی مانع ہے، اور بالفرض یہ روڑا ہے، تو اس سے زبردست روڑا تو یہ ہے کہ آپ خدا پرست ہیں، وہ بت پرست

آپ بتوں کو نہیں پوجتے اور برا بھلا کہتے ہیں، اور وہ پوجتے ہیں اور اپنا معبود جانتے ہیں، تو کیوں نہیں یہ زبردست روڑا بھی راستے سے دور کر دیا جائے اور سب لوگ مل کر بت پرستی شروع کر دیں کہ اس طرح تو کوئی جھگڑا ہی باقی نہیں رہتا، اور آغاز اسلام ہی سے کفار تو یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ "ولا تؤمنوا الا لمن تبع دینکم" اس لئے اس سے بہتر اور کامیاب کوئی دوسری تدبیر اشاعت اسلام کے لئے خوشگوار فضا پیدا کرنے کی ممکن نہیں ہو سکتی

خوشی کا مقام ہے کہ جناب مصنف قربانی کے زبردست حامی ہیں، اور واجب سے بھی بڑھکر ازلی فرض، اور اسلامی فرض جانتے ہیں، لیکن آپ کو جو اعتراض ہے، وہ یہ ہے:-

"خدا نے قربانی فرض کی چوپایوں میں سے، یہ عام ہے۔ اونٹ، گائے، بیل، دنبہ، خصی، بکری، بھیڑ، جو میسر آئے اور بآسانی ہو سکے۔ وہ بھی مقدرت ہونے پر، مجبور ماخوذ نہیں، مکلف نہیں۔ قرآن میں یہ حکم نہیں کہ سات آدمی میں ایک گائے قربانی کرو، یا گائے ہی کی قربانی کرو۔"

اسلام دنیا سے بت پرستی کی بیخ کنی کرنے کو آیا ہے نہ کہ بت پرستی کی تعلیم دینے اور اعانت کرنے کو۔ ایک قوم جب گائے کو اپنا دیوتا جانتی ہے اور مسلمانوں سے اپنی اکثریت اور قوت کے زعم میں زبردستی ان کا جان چھینا چاہتی ہے تو گائے کی قربانی کرنا اسلام کی تبلیغ ہے یا اپنی کمزوری اور قلت کے ڈر سے اپنے حق سے دست بردار ہو جانا؟ اس لئے لازم ہے کہ مسلمان گائے کی قربانی ہرگز نہ چھوڑیں کہ یہ بت پرستی کی ایک طرح کی تعلیم و اعانت ہوگی اور پھر دوبارہ ان کی کمزوری سے دوسرا فائدہ اٹھایا جائے گا اور ان کے دوسرے حقوق کو غصب کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

گائے کی پرستش کی رسم غالباً زمانہ قدیم سے ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بھی بعض قومیں ایسی تھیں، جو گائے کی مورتیں بنا کر پوجتی تھیں چنانچہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر دریا پار ہوئے، تو انھوں نے ایک قوم کو گاؤ پرستی کرتے دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمائش کی کہ

"یٰموسیٰ اجعل لنا الٰھا کما لھم اٰلھۃ" اے موسیٰ ہمارے لئے بھی ایسے ہی معبود بنا دو۔ اور جب حضرت موسیٰ کی عدم موجودگی میں سامری نے ان کی خواہش کے مطابق گوسالہ تیار کر دیا تو اس کی پرستش کرنے لگے اور ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ایک خاص موقع پر گائے ہی ذبح کرنے کا جو حکم دیا "ان اللہ یامرکم ان تذبحوا بقرۃ" وہ شاید اسی مصلحت پر مبنی ہو، کہ کہیں لوگوں کی دیکھا دیکھی گائے کو متبرک اور محترم سمجھ کر بنی اسرائیل اس کو اپنا معبود اور دیوتا نہ بنا لیں، اور اس اصول کے مطابق ہندوستان میں گائے کی قربانی کرنا صرف جائز ہی نہیں بلکہ ضروری اور لازمی ہے۔ اور گائے کی قربانی چھوڑ دینا یہی نہیں کہ عقائد باطلہ اور اوہام فاسدہ کی تقویت و ترویج کا موجب ہوتا ہے، بلکہ ڈر ہے کہ دو چار پشت گزرتے گزرتے ہماری آیندہ نسلیں ہنود کی طرح گائے کی حرمت و تقدس کی قائل ہو کر گئو ماتا کی جے نہ پکارنے لگیں[1]

قرآن میں اگر یہ حکم تصریح کے ساتھ نہیں ہے کہ سات آدمی میں ایک گائے قربانی کرو، تو یہ حکم صریح بھی آپ پیش نہ کر سکے کہ ایک بکری یا بھیڑ گھر بھر کی طرف سے کافی ہے۔ بلکہ یہ قرآنی اشارات کے یکسر خلاف ہے، حج کے ذکر میں ہے:-

لِیَشْھَدُوْا مَنَافِعَ لَھُمْ وَیَذْکُرُوا	تاکہ پہنچیں اپنی فائدہ کی جگہوں پر، اور کئی معلوم دنوں
اسْمَ اللہِ فِیْ اَیَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰی	میں اللہ کا نام لیتے رہیں اس نعمت پر جو چوپایوں
مَا رَزَقَھُمْ مِّنْ بَھِیْمَۃِ الْاَنْعَامِ فَکُلُوْا	مویشی سے اللہ تعالیٰ نے انھیں عنایت فرمائی ہے۔
مِنْھَا وَاَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِیْرَ	تو کھاؤ اس میں سے اور پریشان حال محتاج کو کھلاؤ

[1] الاصلاح۔ اس قسم کے اندیشے تو غیر صحیح نہیں ہیں۔ ہماری آیندہ نسلیں تو در کنار خود ہندوؤں کی آیندہ نسلیں بھی گائے کی پوجا پر قائم نہ رہ سکیں گی۔ لیکن ایک بات موقع کی یاد پڑ گئی کہ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو لیکر تین دن کی راہ بیابان میں جانا چاہتے تھے، اس کا مقصد قربانی تھا اور خاصکر گائے کی قربانی، اور حضرت موسیٰ نے گائے کی قربانی خاص کر اسی لئے پسند فرمائی کہ قبطی گائے کو پوجتے تھے تو انھوں نے چاہا کہ اپنی قوم کو اس بت پرستی کے توڑنے کی تعلیم دیں۔ واللہ اعلم

قربانی کا منشا یہ بیان کیا گیا کہ چند معلوم دنوں میں چوپایوں کی نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر بھیجا جائے۔ یعنی چند دنوں تک گوشت کی اتنی افراط اور ریل پیل ہو کہ خود بھی جی بھر کر کھا سکیں اور غربا و محتاج و مساکین کو بھی کھلا سکیں، چنانچہ عرب میں ایام تشریق، گوشت کھانے اور سکھا کر ذخیرہ کرنے کے لئے مخصوص تھے، اور اگر تمام گھر بھر کی طرف سے ایک خصی یا بکری قربانی کر دی جائے، تو غربا کیا، گھر والوں کے لئے بھی جن کا خاندان بڑا ہے ایک دن کے لئے کفایت نہ کر سکے، اس لئے "ویذکروا اسم اللہ فی ایام معلومات" کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ لیکن ایک گائے کو سات آدمی بفراغت تمام فقراء و مساکین کو کھلا کر دو ایک روز کھا سکتے ہیں۔ اور شاید اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر رسول علیہ الصلاۃ والسلام نے اونٹ، گائے وغیرہ میں سات آدمی کی اجازت دی، اور صحابہ کرام اور علمائے مجتہدین نے اسی پر عمل کیا، اور آپ کے اصول کے مطابق تو عام دنوں میں اور عید اضحیٰ میں کوئی فرق و امتیاز باقی نہیں رہتا جو اس قدر اہتمام کے ساتھ قرآن کریم میں بیان کیا گیا۔

رہا یہ امر کہ اہل حدیث کے یہاں گھر بھر کی طرف سے ایک چوپایہ کی قربانی جائز ہے، اور عملاً ہے۔ تو اول یہ کہ آپ نے اہل حدیث کے اس فعل کو بغیر حجت و دلیل پیش کیا ہے، دوسرے یہ کہ اہل حدیث کا ہر قول و فعل ہمارے لئے حجت نہیں۔ تیسرے یہ کہ انکار حدیث کے بعد آپ کو حدیث سے استدلال کا کوئی حق نہیں، ہمارا آپ کا فیصلہ قرآن ہی سے بہتر طریقہ پر ممکن ہے۔

جناب حافظ صاحب کا ایک اہم اعتراض یہ بھی ہے کہ "حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ خدا نے بطور موعظت و نصیحت بیان فرمایا ہے۔ اس لئے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ قربانی ابراہیمی یادگار ہے، یادگار قائم کرنا سنت اللہ نہیں ہے، خدا نے کسی پیغمبر کی یادگار قائم نہیں کی، خاتم رسل کا دندان مبارک شہید ہوا، بعض پیغمبر شہید ہوئے، کسی کی یادگار نہیں"۔

یادگار ان واقعات کی قائم کی جاتی ہے، جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے نہایت اہم، نادر الوجود،

اور بے مثال ہوں۔ انبیاء علیہم السلام تو خیر انبیاء ہیں، ان کے ادنیٰ خدام بھی خداوند تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے سر کی بازی لگاتے ہیں، اور ذوق وشوق اور انتہائی مسرت کے ساتھ جانیں دیتے ہیں لیکن پردۂ دنیا پر یہ سب سے پہلی، اور شاید سب سے آخری مثال ہوگی کہ بوڑھا اور ضعیف باپ اپنی اکلوتی اولاد کو صرف ایک اشارہ پر محض خدا کی خوشنودی کے لئے اپنے ہاتھوں سے قربان کرنے کو تیار ہو گیا ہو، جان دینا کوئی چیز نہیں خدا کے نام پر لاکھوں کروڑوں نے جان دی اور دیں گے، لیکن جان سے زیادہ عزیز ہستی، عالم پیری ضعیفی اور پیری کی اکلوتی اولاد اور عمر بھر کی کمائی کو اپنے ہاتھوں سے لٹانے کے لئے صرف ایک اشارہ پر تیار ہو جانا، اتنا پر اثر، اتنا اہم، اتنا دردناک اور اتنا عبرت انگیز واقعہ ہے کہ قیامت تک یادگار رہے گا۔ اور خود خداوند عالم نے بھی یادگار بنا کر چھوڑ دینا فرمایا۔

فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ وَنَادَيْنَاهُ أَنْ	پھر جب دونوں نے حکم مان لیا، اور ابراہیم نے
يَا إِبْرَاهِيمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا كَذَٰلِكَ	اسمٰعیل کو ماتھے کے بل پچھاڑا، ہم نے اس کو پکارا
نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ	کہ اے ابراہیم بیشک تو نے خواب کو سچ کر دکھایا، ہم
الْبَلَاءُ الْمُبِينُ وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ	نیکو کاروں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں، بیشک یہ کھلا ہوا
عَظِيمٍ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ	امتحان تھا اور چھڑا لیا ہم نے اس کو ذبح عظیم کے بدلے میں
(صفت ۲۳)	اور باقی رکھا ہم نے اس پر پچھلے لوگوں میں۔

غور کیجئے، بوڑھا باپ اپنے اکلوتے بیٹے کو منہ کے بل گرا کر، کہ محبت فرزندی، محبت الٰہی پر غالب نہ آئے، چاہتا ہے کہ گردن پر چھری پھیر دے، اس دردناک نظارے سے یکایک دریائے رحمت الٰہی جوش میں آتا ہے، اور ندا ہوتی ہے، ابراہیم!! بس بس، تم نے اپنے خواب کو سچ کر دکھایا، اور اس جذبۂ خلت اور فدائیت کے انعام میں ہم نے اسمٰعیلؑ کو ذبح عظیم کا فدیہ دیکر چھڑا لیا، اور پچھلے لوگوں میں ہم نے اسی سنت کو باقی رکھا۔

فرمایئے یہ ذبح عظیم کیا تھا؟ وہ دنبہ یا مینڈھا جو اسمٰعیل علیہ السلام کے عوض میں ذبح ہوا؟ ہرگز نہیں وہ ذبح عظیم، یہی عظیم الشان یادگار ہے، جو سال میں ایک دفعہ اس عظیم الشان واقعہ کی یاد تازہ کرتی ہے اور مسلمانانِ عالم کے جسم و جان میں قربانی اور فدائیت کی روح پھونک دیتی ہے، کہ جس طرح ابراہیمؑ نے خداوند عالم کے حضور اپنی متاع عزیز، اور اسمٰعیل علیہ السلام نے اپنی جان عزیز سے دریغ نہ کیا، ہم بھی حاضر ہیں، اور بطور ثبوت کچھ چوپائے، مویشی جو ہمارے مال و متاع ہیں، اور جنھیں ہم اپنی جانوں کے بعد عزیز رکھتے ہیں، تیری بارگاہ اقدس میں نذر ہیں کہ ہم اسی طرح اپنے معاہدے پر قائم رہیں گے۔

مزید تشفی کے لئے "وترکنا علیہ فی الاخرین" پر غور کیجئے کہ اس کا مطلب بجز اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ پچھلے لوگوں میں ہم نے اسی سنت کو باقی رکھا، کیا اس سے بڑھکر اس سے زیادہ صاف اور صریح الفاظ یادگار قائم کرنے کے لئے دوسرے ہو سکتے تھے؟

اصلاح حال کتاب کے آخر میں جناب حافظ صاحب مسلمانوں کے اصلاح حال کے لئے چند مفید نسخے تجویز فرماتے ہیں، منجملہ اس کے ایک یہ ہے:-

> "اپنی اصلاح حال کے لئے تو یہ کرو کہ 'اتل ما اوحی الیک من کتاب ربک' قرآن مجید کی تلاوت کرو، ثواب کے لئے نہیں، ہدایت و نور حاصل کرنے لئے ....
>
> قرآن مجید بفضلہ آسان ہے، خود سمجھ سکتے ہو تو سبحان اللہ، ورنہ ترجمے سمجھو، ہدایت طلبی سے باز نہ آؤ، اور جو ہدایت ملے اس پر نیت کرو کہ یہ بلاواسطہ خدا نے ہدایت کی ہے اس پر ہم جانبازی سے عمل کریں گے، چاہے کسی کو برا لگے"

قرآن سے ہدایت و نور حاصل کرنے اور قرآن پر عمل کرنے کے لئے کتنی بے خطر راہ تجویز ہوئی ہے کہ خود قرآن کو سمجھنا تو درکنار، ترجمہ دیکھکر بھی تم جو کچھ سمجھو، وہ بالکل اٹل ہے۔ اور ہٹ دھرمی کے ساتھ اس پر قائم رہو، گرچہ تمہیں تم سے بہتر اس سے بہتر سمجھائے، یہ ہے منکرین حدیث کی ذہنیت

اور یہ ہے تبلیغ قرآنی، ایک طالب قرآن کو

تمتع ز ہر گوشۂ یافتم ز ہر خرمنے خوشۂ یافتم

پر عمل کرنا چاہیے، یا قرآن فہمی میں زحمت، اور ترجمے سے جو قرآن سمجھا جائے گا اور جو ہدایت ملے گی، وہ بلا واسطہ کیونکر ہوئی، اور اللہ میاں اور طالب قرآن کے درمیان میں مترجم کا جو واسطہ پڑ گیا اگر وہ واسطہ بھی لایق اعتماد نہ ہو، تو وہ ہدایت کیونکر بھروسے کے لایق ہوگی، اور پھر طلوع الحق، شریعت الحق، منہاج الحق کی تصنیف اور تبلیغ قرآن کے یہ پرزور دعوے کیا معنی رکھتے ہیں اس اصول کے مطابق تو نہ آپ کو حدیث پر کوئی الزام قائم کرنے کا حق ہے، نہ قادیانیوں پر، نہ اور کسی پر، کہ قرآن سے بلا واسطہ جو ہدایت حاصل ہو وہی اعتماد کے لایق، اور جانبازی سے عمل کرنے کے قابل ہے۔

گو جی تو نہیں چاہتا کہ یہ پرلطف صحبت ختم ہو، اور کتاب میں ابھی کافی دلچسپی کا سامان بھی موجود ہے، لیکن "الاصلاح" کے قیمتی صفحات اس قدر سیاہ کر چکا کہ اب ہمت نہیں پڑتی اس لئے ناظرین سے معذرت چاہتے ہوئے رخصت ہوتا ہوں۔ اور جناب حافظ صاحب قبلہ مصنف کتاب سے بھی کہ بایں ہمگی میں نے ان کی تصنیف پر قلم اٹھایا اور بعض مقامات پر قلم بے ساختہ حدود تہذیب سے تجاوز کر گیا ہے، گو وہ آپ ہی کے الفاظ ہیں۔ اور میں نے جو کچھ لکھا ہے، اس میں خطاب عام منکرین حدیث سے ہے، یا جناب کی ذہنیت سے کہ ان اختلافات کے باوجود میں آپ کی ذات گرامی کو مغتنم سمجھتا ہوں، اور دل سے آپ کے تقدس کا قائل، والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

مقالات

سیرت شبلی

۱۰

از جناب مولانا اقبال احمد صاحب سہیل ایم اے علیگ

شیخ صاحب مرحوم کا دوسرا عقد قدرتی طور پر مولانا کی والدہ محترمہ کو شاق تھا۔ اس لئے مولانا اپنی ماں کی ہمدردی میں اپنے پدر بزرگوار سے کسی حد تک کشیدہ خاطر رہتے تھے۔ ماں کی وفات کے بعد یہ جذبہ اور قوی ہو گیا۔ بہرحال سبب جو کچھ بھی رہا ہو مولانا کی حد سے بڑھی ہوئی غیور طبیعت کو باپ کا دست نگر بنکر رہنا بھی گوارا نہ تھا اور یہ چاہتے تھے کہ کوئی ایسی صورت معاش نکل آئے کہ وہ اپنی ذاتی ضروریات کے لئے گھر کی مدد سے بے نیاز ہو کر علمی کام کر سکیں۔ یہ حالات تھے جب کہ ان کو علی گڑھ میں ملازمت پیش کی گئی۔ اہل و عیال کا بار تک ان پر تھا نہیں۔ اپنے ذاتی ضروریات کے لئے اس زمانہ میں طلعہ روپے کافی تھے۔ علی گڑھ میں رہ کر اپنے علم و کمال کا جوہر دکھانے کے مواقع مل سکتے تھے۔ اس نے حالات سے مجبور ہو کر اور آیندہ توقعات کی امید پر بادل ناخواستہ یہ ملازمت منظور کر لی۔ ملاحظہ ہو

ایں جا آرمیدہ ام و ایں مذلت بر خود پسندیدہ ندانم تا چرخ دریں پردہ چہ نیرنگہا است

مولانا کے جذبات اس ملازمت کے متعلق آپنے دیکھ لئے۔ اب ذرا دوسری طرف تصویر کی ایک نگاہ ڈال لیجئے۔ مسلمانوں میں جو گروہ سرسید کا سب سے زیادہ اور شدید ترین مخالف تھا وہ ہی علما کا طبقہ تھا۔ مذہبی خیالات کے اختلاف نے بحث و مناظرہ کی بدولت ذاتی خصومت کی شکل اختیار کر لی تھی

اس جماعت کے بعض افراد تو کفر کے فتووں سے گزر کر سب وشتم پر اتر آئے تھے۔ سرسید لاکھ فرشتہ خصال سہی
آخر انسان ہی تھے کب تک اس مستقل مخالفت کا اثر قبول نہ کرتے۔ علاوہ بریں سرسید کی رائے میں یہی
بزرگوار ملت اسلامیہ کی پستی کے سب سے زیادہ ذمہ دار تھے۔ یہ حالات تھے جن کی بنا پر سید صاحب کو علمائے
مذہبی، ذاتی، اور قومی ہر طرح کی مخالفت پیدا ہو گئی تھی۔ مگر دشواری یہ تھی کہ اس طبقہ سے کلیۃً اجتناب بھی
ممکن نہ تھا۔ اس زمانہ میں کالج کے پاس اتنا سرمایہ کہاں تھا کہ عربی و فارسی ادبیات پڑھانے کے لئے بھی
گوری زمین کے صحیح الون پروفیسر بلائے جائیں اور انہیں دینیات اور امامت نماز کے لئے بھی کسی یوروپین
یونیورسٹی کی ڈگری تلاش کی جائے۔ دوسری دشواری یہ تھی کہ چندہ مسلمانوں ہی سے لینا تھا۔ اور بیاولج
جماعت صرف اسی جال میں پھنس سکتی تھی جس پر کچھ نہ کچھ مذہبی رنگ کا چھینٹا دیا گیا ہو۔

علاوہ بریں جماعت علما کا مقابلہ بھی تو علما ہی کی مدد سے ہو سکتا تھا۔ ان حالات میں انتہائی مخالفت
کے باوجود سید صاحب کو خود علما کی ضرورت تھی مگر ایسے علما جو حتی الوسع ان کے ہم خیال ہوں یا ہم خیال
بنائے جا سکتے ہوں لیکن اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم سے کم ان کی کھلی ہوئی مخالفت نہ کریں۔ اور اگر ان صفات کے ساتھ
قابل اور اہل قلم بھی ہوں جو اتحاد خیال کے بعد سرسید کی قلمی جنگ یا اشاعت خیال میں مدد دے سکیں۔ یا
کم سے کم علمی حیثیت سے اس جدید الخیال جماعت کے لئے باعث تقویت و تفاخر ہوں تو فہو المراد۔
مولانا شبلی کے متعلق اتنا تو سرسید کو معلوم ہی تھا کہ ان کے چھوٹے بھائی خود اسی کالج میں پڑھ رہے ہیں۔
ان کے والد تحریک جدید کے موید ہیں۔ اس لئے سرسید کو ان کی ذات سے کسی مخالفت کا خطرہ نہیں
ہو سکتا تھا۔ مولانا ابھی جوان تھے اس لئے سرسید نے خیال کیا ہو گا کہ ان پر قدیم تعلیم کا رنگ ابھی بہت
پختہ نہ ہوا ہو گا۔ اور ممکن ہے کہ بتدریج ہم خیال بنائے جا سکیں۔ قابلیت کے متعلق اتنا ہی کافی تھا کہ وہ
فاروق، مولانا ارشاد حسین، مولانا فیض الحسن اور حافظ احمد علی محدث رحمہم اللہ کے حلقہ درس سے فارغ
و تکمیل کے درجہ تک استفادہ کر چکے ہیں۔ علاوہ بریں ان کا عربی قصیدہ دیکھا اور ان سے گفتگو کرنے کے بعد

سرسید جیسے تجربہ کار، سب جج اور مردم شناس بزرگ کو مولانا کی استعداد علمی کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہو ہی گیا ہو گا۔
زبان عربی کا درس دینے کے لئے ایک مولوی کی ضرورت تھی ہی۔ زمانہ وہ تھا جبکہ علی گڑھ کے نام سے
علما کا طبقہ بھڑکتا تھا اور خود سرسید اس جماعت سے خائف اور بدگمان تھے۔ ان حالات میں مولانا شبلی
سے بہتر آدمی ان کو کہاں ملتا۔ اس لئے انھوں نے بھی ضرورتاً اور مصلحتاً آیندہ توقعات کی بنا پر مولانا کا
تقرر منظور کر لیا۔

اس تعلق کے بعد کچھ دنوں تک ایک دوسرے کے جذبات خیالات اور معلومات کو محتاط طریق
پر تجسس اور تنقید کی نگاہ سے دیکھتے رہے۔ عمر کے اعتبار سے سید صاحب غالباً مولانا کے والد کے ہمعصروں
میں تھے بلکہ ممکن ہے کہ ان سے بھی بڑے ہوں۔ اثر و اقتدار کے لحاظ سے اسلامی ہند میں بجز والیان ریاست
کے غالباً کوئی دوسرا شخص سرسید کا حریف نہ تھا۔ ان کی زبان و قلم سے ملک اور قوم کی واقعی قابل قدر
خدمتیں انجام پا چکی تھیں۔ اب تک اپنے مقاصد میں بلا استثنا کامیاب ہوتے آ رہے تھے۔ حاشیہ نشینوں سے
بجز ادب و اطاعت کے کچھ دیکھا نہ تھا۔ اور سوائے "بجا" و "درست" کے کچھ سنا نہ تھا۔ ان حالات کا اجتماع
جس غیر محسوس طریقہ پر بتدریج کسی انسان میں انانیت کی نشو و نما کر سکتا ہے اس کا اندازہ ہر اس شخص
کے لئے آسان ہے جس نے علم النفس کی ابجد بھی پڑھی ہے۔ علما کی مخالفت نے رفتہ رفتہ سرسید کو اپنے قدیم
علوم بلکہ قدیم تمدن و معاشرت سے بھی بیزار کر دیا تھا۔ اور انگریزوں کے ساتھ جو خوشگوار تعلقات ابتداءً
مسلمانوں کی بھلائی کے لئے قائم کئے گئے تھے وہ رفتہ رفتہ شیفتگی اور بالآخر مرعوب زدگی کی حد تک پہنچ گئے
تھے۔ اور نوبت یہاں تک آ گئی کہ اگر "تزک جہانگیری" میں کسی نایاب نمونہ مصوری کا ذکر پڑھتے تو فوراً یہ خیال
پیدا ہوتا کہ مصور یقیناً کوئی فرنگی باکمال ہو گا۔ مسٹر بیک جو کہ مدتوں تک کالج کے پرنسپل رہے اعلیٰ درجے
کے سیاسی شاطر تھے۔ انھوں نے سرسید کی اس مزاجی کیفیت سے خوب فائدہ اٹھایا یہاں تک کہ رفتہ رفتہ
علی گڑھ کی سیاسی بساط پر اپنے آپ کو فرزیں اور سرسید کو شاہ شطرنج بنا کر چھوڑا۔

الٹی خبر شیخ و برہمن کے دین و ایماں کی   وہ چھانے جاتے ہیں سب پر جمال ہمنشیں ہو کر

وہی سرسید جو ابھی چند روز پیشتر ملکی آزادی اور اتحادِ وطن کے بڑے حامی تھے اور بنگالیوں کی ملکی ترقی اور سیاسی سرگرمی پر فخر کیا کرتے تھے اب طوطیِ پس آئینہ کی طرح استادِ ازل کے الفاظ دہرا رہے تھے۔ اور برادرانِ وطن کی نسبت اپنے شان کے خلاف دل آزار جملوں سے بھی احتراز نہ کرتے۔ مغربی معاشرت جو شروع میں حکمران قوم کے ساتھ اظہارِ مساوات کے خیال سے اختیار کی گئی تھی اب غلامانہ اتباع اور پرستارانہ تقلید میں بدل گئی اور اس ظاہری نقالی اور صوری تتبع نے حقیقی نیازمندی اور معنوی غلامی کی بنا ڈالی۔ طلبہ مغربیت کو ترقی۔ اور فرنگیت کو تمدن کا مترادف سمجھنے لگے۔ اور اپنی قومی روایات اور قومی تمدن سے بیزاری ہو گئی۔ قدرتی طور پر یہ منظر مولانا کو ناگوار تھا۔

علاوہ بریں خود سیاسیات میں بھی انکا مسلک سرسید کے اس جدید طرزِ عمل کے خلاف تھا۔ جو در اصل مسٹر بیک کی جادوگری کا ایک شعبدہ تھا۔ مولانا شبلی شروع سے ہندو مسلم اتحاد اور شرکت کانگریس کے حامی تھے۔ ان کی رائے میں ملکی آزادی کے لئے آئینی جد و جہد ہندوؤں سے زیادہ مسلمانوں کا فرض تھا۔ سیاسیات سے مسلمانوں کی علیحدگی کو وہ قومی خودکشی کے برابر سمجھتے تھے۔ چنانچہ شروع میں مولانا نے ایک مضمون بھی شائع کرایا۔ مگر بعد کو مصلحتاً یا کسی چشم نمائی کی بنا پر خاموش ہو کر ہمہ تن تاریخی تصنیفات پر متوجہ ہو گئے۔ لیکن ۱۸۹۵ء سے لیکر سرسید کی وفات تک اندرونی کشمکش روز بروز بڑھتی گئی۔ اور حسبِ ذیل واقعات نے اس کشمکش میں اور بھی اضافہ کر دیا۔

علی گڑھ کے رہنے والے ایک ہندو صاحب جو کافی پڑھے لکھے اور صوفیانہ خیال کے آدمی تھے۔ اعظم گڈھ میں پوسٹ ماسٹر تھے۔ انھوں نے سرسید کے مضمون الدعا والاستجابہ کی تردید میں ایک دلنشین رسالہ شائع کیا۔ جس پر نواب وقار الملک بہادر نے نہایت عمدہ ریویو کیا۔ اور اس ریویو کے سلسلہ میں اس بات پر اظہارِ افسوس کیا کہ سرسید جو نہ صرف خود مسلم اور جماعت اسلامی کے مسلمہ لیڈر ہیں بلکہ خانوادہ رسالت کے چشم و چراغ بھی ہیں۔ وہ تو دعا کو جو بندہ و خدا میں ربط کا واحد ذریعہ ہے غیر ضروری اور فضول بتائیں اور ایک ہندو جس کو کافر کہا جاتا ہے ایک اسلامی مسئلہ کی حمایت کرے۔ اس رسالہ کی قوت استدلال

اور اندازِ بیان سے بعض لوگوں کو شبہہ ہوا کہ در اصل مولانا شبلی اس کے مصنف ہیں۔ اس شبہہ کو مزید تقویت اس امر سے پہنچی کہ مصنف اعظم گڈھ میں پوسٹ ماسٹر تھے۔ اور مولانا شبلی کے خاص معتقد۔ اسی دوران میں سرسید نے اپنی تفسیر کو عربی میں ترجمہ کرانا چاہا اور جب مولانا شبلی نے اپنی مصروفیتوں کی بنا پر عذر کیا۔ تو مولانا حمید الدین فراہی پر نگاہ پڑی۔ جو اس وقت کالج میں پڑھ رہے تھے۔ ترجمہ کا معاوضہ معقول یعنی فی ورق کے حساب سے پیش کیا جا رہا تھا .... مگر مولانا حمید الدین نے انکار کر دیا اور جب سرسید نے بہ اصرار اس کی وجہ دریافت کی تو صاف کر دیا کہ وہ اشاعتِ باطل اور تعاون علی الاثم کی معصیت میں مبتلا ہونا نہیں چاہتے۔ مولانا حمید الدین کی اس صاف گوئی سے علامہ شبلی کا کوئی تعلق نہیں تھا مگر سرسید کی بدگمانی میں اس سے بھی اضافہ ہوا۔ کم و بیش اسی زمانے میں کشمکش کی ایک اور صورت پیدا ہو گئی۔

سرسید کو اپنی لائف مرتب کرانے کا خیال پیدا ہوا اور یہ کام علامہ شبلی سے لینا چاہا۔ مولانا اس سے پہلو بچانا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس بارے میں جتنی بالواسطہ تحریکیں مولانا سے کی گئیں ان کو مولانا بلطائف الحیل ٹالتے گئے۔ آخر نواب اسماعیل خاں صاحب رئیس دتاولی کا ایک خط بنام سرسید اس مضمون کا آیا کہ نواب صاحب نے [illegible] میں یہ خواب دیکھا ہے کہ مولوی شبلی صاحب آپ کی لائف لکھ رہے ہیں۔ مولانا کو یہ خط دکھلایا گیا۔ مگر اس کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کے بعد سرسید مرحوم مولانا کو بلا کر کچھ حالات نوٹ کراتے رہے اور مولانا بغیر کسی اضافہ یا کمی کے بجنسہٖ املا کرتے جاتے۔ اس طرح جب یہ آخری تدبیر بھی ناکام رہی تو سرسید نے بادلِ ناخواستہ یہ خیال ترک کر دیا اور مولانا حالی کو اس خدمت کیلئے طلب فرمایا۔ اس حال میں مولانا کیلئے علیگڑھ کا قیام بحیثیت ملازم کچھ زیادہ موزوں نہ تھا۔ مگر علیگڑھ چھوڑ کر جاتے کہاں؟ اور کرتے کیا؟ کیونکہ اس کشمکش کے باوجود سرسید اور اربابِ علیگڑھ کو مولانا سے اور مولانا کو سرسید کی شخصیت اور علیگڑھ کی فضا سے جو لگاؤ پیدا ہو چکا تھا۔ اسکا آسانی سے منقطع ہونا ممکن نہ تھا۔

اور مذکورہ بالا واقعات میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جس سے مولانا کو سرسید یا ان کے رفقائے کار سے کوئی ذاتی شکایت پیدا ہو۔ لیکن اس بدگمانی کی فضا میں ایسی شکایتوں کا رونما ہو جانا کچھ دشوار نہ تھا۔ چنانچہ بہت جلد یہ صورتیں بھی پیدا ہو گئیں۔

(باقی)

تصوف اسلام

از جناب ڈاکٹر احمد علوش

تصوف تاریخ کی روشنی میں

بہت سے لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ تصوف اگر کوئی صحیح چیز ہے تو صدر اسلام میں کیوں نہیں پھیلا، صحابہ اور تابعین کے دور کے بعد اس کی اشاعت کیوں ہوئی؟ اسکا جواب یہ ہے کہ اس زمانہ میں تصوف کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس مبارک عہد کے سب ہی مسلمان اصحاب ورع وتقوی اور ارباب مجاہدہ وریاضت تھے۔ کچھ تو اس لئے کہ ان کی طبیعت ہی نیکی و پرہیزگاری کے سانچے میں ڈھل چکی تھی اور زیادہ تر اس لئے کہ عہد نبوت کے قرب واتصال کی وجہ سے اس زمانہ کے مسلمانوں کے لئے باہمی سبقت ومقابلہ کا اصل میدان درحقیقت اتباع نبوت کا میدان تھا۔ ہر شخص کی سب سے زیادہ لذیذ آرزو یہی تھی کہ اس مقابلہ میں گوئے سبقت لے جائے۔ پس کوئی ضرورت نہ تھی کہ جو چیز ان میں علی وجہ التمام خود موجود ہے اس کی تعلیم کے لئے ان کو سبق پڑھائے جائیں۔ ان کی مثال تو ایسی تھی جیسے ایک خالص عرب جس نے اپنی زبان کے قواعد، اس کے اسلوب اور اس کی بلاغتیں ماں کے دودھ کے ساتھ پی ہوں اور محض اپنی فطرت کی تحریک اور طبیعت کی شہ سے نہایت عمدہ اور دلآویز شعر کہتا ہو، اس کو کیا پڑی ہے کہ ہماری طرح مدرسوں میں بیٹھکر نحو و بلاغت کے مسائل رٹنے میں اپنا دماغ کھپائے! لیکن ہاں یہی قواعد نحو ولغت جو ایک خالص عرب کے لئے بالکل غیر ضروری تھے اس وقت ضروری ہوگئے جب زبانوں اور قوموں کے اختلاط سے زبان کے اصولوں میں لوگوں سے غلطیاں ہونے لگیں۔ یا غیر عرب قوموں نے عربی زبان کو سیکھنا چاہا۔ علاوہ ازیں خود اجتماعی ضروریات کی تدریجی رفتار ترقی کا ایک آئین ہے کہ علوم وفنون صدیوں

میں آہستہ آہستہ اپنی طبعی راہ پر بڑھتے ہیں پھر باضابطہ مدون ہوکر اجتماعی ضروریات کے خانہ میں اپنے لئے ایک مستقل جگہ مخصوص کرلیتے ہیں۔

جو حال اس معاملہ میں صحابہ کا تھا کم وبیش وہی حال تابعین کا تھا۔ ہر چند کہ وہ صوفی کے نام و لقب سے موسوم نہیں ہوئے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ عملاً وہ صوفی تھے۔ آخر تصوف کا مقصد کیا ہے؟ یہی نہ کہ آدمی اپنے نفس کے لئے نہ جئے اپنے خدا کے لئے جئے۔ پرہیزگاری وتقویٰ سے ہمیشہ آراستہ رہے۔ خدا کے حضور میں اپنے قلب وروح کے سچے اخلاص کے ساتھ ہر لحظہ حاضر رہے! سو ان چیزوں میں کون ہے جو صحابہ وتابعین کا حریف ہوسکے؟ وہ روحانی ترقی کے جن مراتب عالیہ تک پہنچے ان سے پہلے یا ان کے بعد ان مراتب تک کون پہنچ سکا؟ انھوں نے صرف اسی پر بس نہیں کیا کہ عقاید ایمان اور فرائض اسلام کا اقرار کرلیا ہو۔ انھوں نے اس اقرار کے ساتھ ذوق وحال کی تمام کیفیتیں اور سرمستیاں بھی جمع کرلی تھیں اور اس استغنا وکمال کے ساتھ کہ اس خم میں بھی دوسروں کے لئے ایک قطرہ تک نہ چھوڑا۔ انھوں نے اسلام کے فرائض وواجبات کے پہلو بہ پہلو ان تمام سنن ونوافل کو بھی ادا کیا جن کے متعلق ان کو علم ہوا کہ پیغمبر کو پسند تھیں۔ انھوں نے تمام محرمات کے ساتھ تمام مکروہات سے بھی اپنے تئیں دور رکھا جس کے فیض سے ان کے دل کی آنکھیں روشن ہوگئیں۔ ان کے سینوں سے حکمت کے چشمے پھوٹ نکلے اور ان کی پسلیوں سے ربانی فیوض کی سوتیں جاری ہوگئیں۔

صحابہ، تابعین، تبع تابعین کے تینوں دور انوار واذکار کے دور تھے اور یہی دور درحقیقت تاریخ اسلام کا سب سے زیادہ مقدس اور روحانی دور تھا۔ اسی لئے حضور نے فرمایا کہ بہترین دور میرا دور ہے پھر وہ جو اس کے بعد ہے، پھر وہ جو اس کے بعد ہے۔

لیکن جب یہ دور گذر گیا، مختلف قومیں اور نسلیں اسلام کے حلقہ میں داخل ہوئیں اور تعلیم وارشاد اور علوم وفنون کی نئی نئی راہیں کھلیں تو ضرورت پیش آئی کہ تقسیم کار کے اصول پر ہر علم وفن کے

ارباب اختصاص و کمال اپنے اپنے علوم و فنون کے ساتھ مخصوص ہو جائیں۔ چنانچہ جو جماعت جس فن کے ساتھ خاص لگاؤ رکھتی تھی، وہ اس کی خدمت و اصلاح کے لئے الگ ہو گئی۔ اسی اصول پر سب سے پہلے صدر اول میں فن نحو وجود میں آیا پھر علم فقہ، علم توحید، علم حدیث، اصول دین و تفسیر، منطق، اصطلاح حدیث اور علم اصول و فرائض وغیرہ کی بنیادیں پڑیں۔ کچھ دنوں کے بعد نظر آیا کہ دینی روح آہستہ آہستہ لوگوں میں کمزور پڑ رہی ہے۔ اور عبادت اور پابندی شریعت کا ذوق سرد ہو رہا ہے اس چیز نے ارباب ریاضت و زہد کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ **علم تصوف** کی تدوین کی طرف متوجہ ہوں اور دوسرے علوم و فنون کے مقابل میں اس علم کی فضیلت و برتری واضح کریں۔

بعض مستشرقین کو یہ سوءظن ہے کہ فن تصوف کی تدوین درحقیقت ارباب تصوف کی طرف سے دوسرے علوم و فنون کے مدونین کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے۔ لیکن یہ بات واقعہ کے خلاف ہے۔ ارباب تصوف نے اپنے فن کی تدوین کسی احتجاجی جذبہ کے ماتحت نہیں کی ہے۔ ان کو یہ گوشہ ناقص نظر آیا پس انھوں نے اس کی تکمیل کر دی۔ نیکی و تقویٰ کی راہوں میں سرگرمی و نشاط پیدا کرنے کے لئے ضروری تھا کہ ان کا عظیم الشان فن وجود میں آئے۔

تصوف کے ابتدائی ائمہ نے اپنے تمام اصول، جیسا کہ تاریخ اسلام سے ثابت ہے ثقات سے اخذ کئے تھے۔ ہجرت کی پہلی صدی کا واقعہ ہے کہ چند مہاجرین اور چند انصار نے مل کر باہم یہ عہد کیا کہ وہ دنیاوی مطامع اور رغبات سے حتی المقدور الگ رہ کر اللہ کی عبادت اور آخرت کے اہتمام میں زندگی بسر کریں گے اور اپنے تمام اوقات بالعموم اور شب اور سحر کے اوقات بالخصوص اللہ کی یاد اور نماز کے لئے مخصوص رکھیں گے۔ ان کا یہ معاملہ بمنزلہ ایک عہد کے تھا جو انھوں نے اپنے اوپر عائد کر لیا تھا اور جس کی عدم پابندی کی شکل میں وہ اپنے کو گنہگار سمجھتے تھے۔ بس یہی واقعہ اہل طریقت کے مابین عہد کی بنیاد ہے جو اس وقت سے لیکر آج تک قائم ہے۔

ان لوگوں نے فقر و زہد کی جو زندگی اختیار کی تو اس بارہ میں ان لوگوں کے لئے دلیل آنحضرتؐ کا یہ ارشاد تھا کہ "الفقر فخری" فقر میرا فخر ہے۔ یہیں سے اہل طریقت نے اپنی جماعت کو "فقراء" کی جماعت سے موسوم کیا اور جو شخص انکی جماعت میں داخل ہو کر ان کے طریق کو اختیار کرلے وہ فقیر ہے لیکن فقیر کے معنی ان کے ہاں یہ نہیں ہے کہ ایک شخص دوسروں کی مدد کا محتاج ہو۔ فقیر ان کی اصطلاح میں وہ شخص ہے جو اللہ کی رحمت و رضوان کی طلب میں تمام دنیا سے بے پروا ہو گیا ہو۔

اسی طرح ان لوگوں کے ہاں یہ بھی ثابت ہے کہ آنحضرتؐ نے صحابہ کو لا الہ الا اللہ کے ذکر کی تلقین فرمائی۔ الگ الگ بھی اور جماعت کی صورت میں بھی۔ شداد بن اوس راوی ہیں اور روایت صحیح ہے کہ۔ ہم لوگ آنحضرتؐ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ جماعت میں کوئی غیر تو نہیں ہے؟ یعنی کوئی اہل کتاب میں سے؟ ہم نے عرض کیا، نہیں اے رسول اللہ۔ تو آپ نے دروازہ بند کرنے کا حکم دیا اور کہا اپنے ہاتھ اٹھاؤ اور کہو لا الہ الا اللہ پس ہم نے کچھ دیر تک اپنے ہاتھ اٹھائے اور لا الہ الا اللہ کا ذکر کیا۔ پھر حضورؐ نے فرمایا کہ تم کو خوشخبری ہو اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کو بخش دیا۔

صحابہ کو الگ الگ بھی آپؐ نے ذکر کی تلقین فرمائی، حضرت علی بن ابی طالبؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلعم سے عرض کیا کہ رسول اللہ، مجھے اللہ تک پہنچنے کا وہ راستہ بتلایئے جو سب سے زیادہ قریب سب سے زیادہ سہل، اور سب سے زیادہ افضل ہو۔ آپ نے فرمایا اے علی سراً و جہراً ذکر الٰہی کی مداومت کرو۔ حضرت علی نے فرمایا کہ ذکر تو سب ہی کرتے ہیں، اے رسول اللہ میری خواہش یہ ہے کہ مجھے کوئی خاص چیز تعلیم فرمایئے۔ آپ نے فرمایا اے علی، سب سے افضل کلمہ جو میری زبان پر اور مجھ سے پہلے انبیاء کی زبان پر جاری ہوا وہ لا الہ الا اللہ ہے۔ الحدیث

یہی روایت اہل تصوف کے ہاں تلقین ذکر کی بنیاد ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک یہ ذکر گویا ایک زنجیر ہے جو اہل حلقہ کے دلوں کو باہم جوڑ دیتی ہے اور یہ سلسلہ درجہ بدرجہ رسول اللہ صلعم تک منتہی

ہوتا ہے۔ اس حلقہ میں داخل ہو جانے کے بعد ایک مخلص مرید کو کم سے کم جو چیز حاصل ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جب وقت اس کی زبان زمزمہ سنج ذکر ہوتی ہے تو تمام اولیاء کی ارواح اس ذکر میں اس کی ہمنوائی کرتی ہیں اور زنجیر کے ایک حلقہ کی حرکت گویا پوری زنجیر کو جو اس کے شیخ سے لیکر حضرت رسول اللہ تک وسیع ہے متحرک کر دیتی ہے۔ چنانچہ جب تک کہ کوئی شخص اس طریق تلقین میں شریک نہ ہو ارباب تصوف اس کو اپنی جماعت کے اندر نہیں شمار کرتے اور ایسے شخص پر انوار و برکات کے وہ دروازے نہیں کھلتے جو خواص حلقہ کے لئے مخصوص ہیں۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ جو خلیفہ اول تھے اس قسم کے فقراء کی ایک جماعت کی قیادت فرماتے تھے۔ اسی طرح خلیفہ چہارم حضرت علی بن ابیطالبؓ بھی فقراء کی ایک جماعت کے سرخیل تھے۔ حضرت ابو بکرؓ کی وفات کے بعد ان کے طریقہ کی زمام حضرت سلمان فارسیؓ نے اپنے ہاتھوں میں لی جو نسلاً ایرانی اور کبار صحابہ میں سے تھے۔ اسی طرح حضرت علیؓ کی وفات کے بعد ان کی مسند طریقت حضرت حسن بصریؓ نے سنبھالی۔ اور یہ دونوں اصحاب اپنے اپنے طریقہ میں اپنے شیوخ کے باقاعدہ خلیفہ تھے اور اسی نام سے موسوم۔ اسی اصول پر آج تک مذاہب تصوف کے جانشینوں کے لئے خلیفہ کا لقب مروج چلا آتا ہے۔

ہمت اور خالص اعتراف عبودیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں استغراق کا اصول ارباب تصوف نے آیت ذیل سے استنباط کیا ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ	کہدو، اگر تمھارے باپ، تمھارے بیٹے، تمھارے بھائی
وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا	تمھاری بیویاں اور تمھاری قوم کے لوگ اور وہ مال
وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ	جو تم نے کمایا ہے اور وہ تجارت جس کی کساد بازاری
تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ	کا تمھیں اندیشہ ہے اور وہ مکانات جو تمھیں پسند
وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ	ہیں اگر یہ سب چیزیں تم کو اللہ، اس کے رسول
بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ	اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو
الْفٰسِقِيْنَ	انتظار کرو تا آنکہ اللہ کا امر ظاہر ہو جائے اور اللہ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا

چنانچہ اہل تصوف اپنا اولین فرض یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ واحد کی بندگی کی راہ میں تمام دنیاوی مصالح و زخارف کی قربانی کے لئے ہمہ تن آمادہ رہیں۔ اللہ کی بندگی اور ذکر سے نہ کاروبار تجارت ان کو غافل کر سکے نہ اہل و عیال۔ ہر حال میں اپنے سامنے اس اعلیٰ نصب العین کو رکھیں جو ان کے وجود کی اصل غایت ہے۔ یعنی وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون۔ میں نے نہیں پیدا کیا جنوں اور انسانوں کو مگر اس لئے کہ وہ میری بندگی کریں۔

اس جماعت کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے تقرب الٰہی کے لئے جس چیز کو اصل الاصول کی حیثیت سے پیش نظر رکھا ہے وہ یہ ہے کہ فرائض و واجبات کی ادائگی کے علاوہ صبح و شام کچھ اوراد و وظائف کا بھی التزام رکھیں اور ان اوراد و وظائف میں سب سے مقدم لا الہ الا اللہ کا ذکر اور درود شریف کا ورد ہے۔

اہل تصوف تجربہ و ممارست کی بناء پر دعویٰ کرتے ہیں کہ حضور قلب اور اس مخصوص کیفیت کے ساتھ، جو ان کے شیوخ و اکابر سے منقول ہے، ذکر الٰہی کرنا تصفیہ باطن اور تنویر قلب میں ایسا دخل رکھتا ہے کہ زبان قلم سے اس کی تعریف ممکن نہیں اور بعینہٖ یہی خصوصیت درود شریف کے ورد کو حاصل ہے۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ درود کو نماز میں پڑھنے کا حکم مسلمانوں کو قرآن مجید میں دیا گیا ہے اور یہ ہر مسلمان پر فرض ہے۔ خواہ صوفی ہو خواہ عامی۔ البتہ صوفیائے کرام اس کا پورا اہتمام رکھتے ہیں اس لئے کہ قلب کی صفائی اور روح کے تزکیہ کے لئے یہ اکسیر ہے اور اس کا سب سے بڑا مظہر یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت قلب پر پوری طرح چھا جاتی ہے۔

صوفیوں کا صوفی کے لقب سے ممتاز ہونا ساتویں عباسی خلیفہ مامون کے زمانہ سے ملتا ہے۔

اس سے پہلے یا تو وہ لقب سے ملقب نہیں ہوئے تھے یا یہ ہو کہ معتمد کتب تصوف میں ان کا یہ لقب اس وقت تک نہ داخل ہوا ہو اور یہ اقرب ہے۔

مامون کا زمانہ ۱۹۰ھ یا ۸۱۳ء ـــ ۸۳۳ء کا زمانہ ہے اور معلوم ہے کہ یہ دور عربی علوم و ادب کے فروغ و کمال کا سب سے زیادہ روشن دور ہے۔ اسی زمانہ میں عربوں نے دوسروں کے علوم و فنون اپنی زبان میں منتقل کئے۔ معلوم ہوتا ہے اسی زمانہ میں یونانی لفظ تھیو سوفیا ان کے سامنے آیا اور انھوں نے اس کو عربی قالب میں ڈھال کر اپنے یہاں کی جماعت فقراء کے لئے پسند کر لیا اور اسکی ضرورت انھوں نے اس لئے محسوس کی ہوگی کہ "فقرا" کا لفظ صوفیائے کرام کی جماعت کے اصلی مقصد و مسلک کی تعبیر کے لئے ناکافی تھا۔ اور یہ لفظ ان کی تمام امتیازی خصوصیات کو نمایاں کرنے کیلئے بہت جامع نظر آیا۔ پچھلے صفحات میں ہم اس پر کسی قدر روشنی ڈال چکے ہیں۔ یہاں زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں۔

"صوفیت" اور "صوفی" کا مخرج بھی تھیوسوفیا ہی ہے۔ یہ دونوں لفظ بھی اسی سے تراش لئے گئے ہیں۔ پہلے کا اطلاق علم تصوف پر ہوتا ہے اور دوسرے کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے جو اس علم کو اختیار کرے۔ اس طرح متصوف اور تصوف میں مقدم الذکر کا اطلاق سالک طریقت پر ہوتا ہے۔ اور موخر الذکر کا طریق سلوک پر۔

تصوف کے مختلف طریقے تصوف کے تمام طریقوں میں سے جو طریقہ سب سے پہلے ایک باقاعدہ منظم شکل میں قائم ہوا وہ طریقہ علوانیہ ہے جس کے بانی شیخ علوان ہیں جن کا زمانہ ۱۴۹ھ مطابق ۷۶۶ء ہے۔ اس کے بعد امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ دوسرے طریقے وجود میں آئے اور ہر طریقہ اپنے شیخ اور بانی کے نام سے موسوم ہوا۔ آج تصوف کے جو طریقے موجود ہیں ان کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ ان سب کو شمار کرانا ناممکن ہے۔ ہم صرف مشہور طریقوں کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں

نام طریقہ	بانی	مقام دفن	تاریخ قیام و بناء	
۱ علوانیہ	شیخ علوان	جدہ	۱۴۹ھ	۷۶۶ء
۲ ادہمیہ	ابراہیم بن ادہم	دمشق	۱۶۱ھ	۷۷۷ء
۳ بسطامیہ	امام ابویزید بسطامی	جبل بسطام	۲۶۱ھ	۸۷۴ء
۴ سقاطیہ	امام سری الدین سقطی	بغداد	۲۹۵ھ	۹۰۷ء
۵ جیلانیہ	سید عبدالقادر جیلانی	"	۵۶۱ھ	۱۱۶۵ء
۶ رفاعیہ	سید احمد رفاعی	"	۵۷۶ھ	۱۱۸۲ء
۷ سہروردیہ	امام شہاب الدین سہروردی	"	۶۰۲ھ	۱۲۰۵ء
۸ شاذلیہ	ابوالحسن شاذلی	قصیر ساحل بحر احمر	۶۵۶ھ	۱۲۵۸ء
۹ مولویہ	مولانا جلال الدین رومی	قونیہ	۶۷۲ھ	۱۲۷۳ء
۱۰ احمدیہ	سید احمد بدوی	طنطا	۶۷۵ھ	۱۲۷۶ء
۱۱ نقشبندیہ	سید پیر محمد نقشبند	قصر عرفان	۷۱۹ھ	۱۳۱۹ء
۱۲ سعدیہ	امام سعدالدین	دمشق	۷۳۶ھ	۱۳۳۵ء
۱۳ بکتاشیہ	الحاج بکتاش	کیر شہر البانیہ	۷۵۶ھ	۱۳۵۷ء
۱۴ خلوتیہ	سید عمر خلوتی	قیصریہ	۸۰۰ھ	۱۳۹۵ء
۱۵ برہامیہ	سید الحاج برہام	انگورہ	۸۶۶ھ	۱۴۶۱ء
۱۶ بکریہ	سید ابوبکر وفائی	حلب	۹۰۲ھ	۱۴۹۶ء
۱۷ جلشانیہ	سید ابراہیم جلشانی	قاہرہ	۹۴۰ھ	۱۵۳۳ء
۱۸ جمالیہ	سید جمال الدین	استنبول	۱۱۶۴ھ	۱۵۶۰ء

تصوف کے مشہور طریقے یہی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کچھ طریقے ہیں لیکن چونکہ وہ اس شہرت کو نہیں پہنچے ہیں اس لئے ہم نے ان کا ذکر نہیں کیا ہے۔ ان مختلف طریقوں میں کوئی بنیادی اور اساسی اختلاف نہیں ہے۔ صرف اذکار و وظایف کی نوعیت مختلف طریقوں میں مختلف ہے۔ خاص خاص صوفیوں کو مکاشفہ اور الہام سے معلوم ہوا کہ اسمائے حسنیٰ میں سے فلاں اسم خاص انوار و برکات کا سرچشمہ ہے۔ بس یہی چیز نئے نئے طریقوں کے قیام کا سبب بن گئی۔ حالانکہ معلوم ہے کہ یہ محض جزوی اختلاف ہے۔ اس سے نفس حقیقت میں کوئی اختلاف نہیں ہوا۔ اسی طرح امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ تصوف کے مختلف اسکول قائم ہوتے گئے۔

مختلف طریقوں میں جو مختلف قسم کے اوراد و اذکار اور مختلف ریاضتیں رائج و مقبول ہیں ان سب کی تفصیل کرنا میرے لئے ناممکن ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اختصار کے ساتھ صرف وہ مراحل و مقامات بیان کردوں جو طریقہ خلوتیہ کے ایک پیرو کو طے کرنے پڑتے ہیں اور بحمداللہ یہ مراحل اپنے شیخ سید عبداللہ بن محمد بنار قدس سرہ کی رہنمائی میں مجھے وہ بھی طے کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے اور گو بظاہر یہ ایک خاص سلک کا بیان ہوگا لیکن حقیقت کے اعتبار سے یہ بیان بحیثیت مجموعی تمام دوسرے طریقوں پر منطبق ہوگا۔ صرف جزئیات میں کچھ فرق ہوگا اور یہ فرق چنداں معتبر نہیں۔ (باقی)

معین المنطق: حصہ اول و دوم کے نام سے یونیورسٹیوں اور مدارس اسلامیہ کے طلبہ کیلئے سب سے زیادہ سلیس اردو میں منطق کی پہلی اور دوسری کتاب پر مشتمل نئے طرز پر ایک سہل جدید کورس جناب مولانا مفتی محمود حسن صاحب مدرس اول جامعہ حسینیہ لدھیانہ نے تیار کیا ہے۔ جس پر ماہرین فن اور جرائد نے بہترین ریویوز اور پسندیدہ سفارشیں تحریر فرمائی ہیں۔

اس کورس میں تحقیق، اختصار، جامعیت کے ساتھ مضامین فن تمہیدات، نقشہ جات، تعریفات کے ضمن میں ایسی تسہیل و توضیح سے پیش کئے گئے ہیں کہ اسکو حصول فن اور امتحانات میں کامیابی کی گارنٹی تسلیم کرنے میں تامل نہ ہوگا۔ ان اغراض کے پیش نظر ہر ایک طالب علم کو اسکا ایک نسخہ ضرور زیر مطالعہ رکھنا چاہئے۔ قیمت حصہ اول ۳ر اور حصہ دوم قسم اول ۸ر قسم دوم ۶ر **منیجر**

اشتراکیت پر ایک سرسری نظر

(۳)

از ناظر اصلاحی

اشتراکیت کا ہتھیار پچھلی صحبت میں ہم نے دکھایا ہے کہ کارل مارکس اور اس کے ساتھیوں کے سامنے اصلاح کی کوئی کوشش نہ تھی۔ صرف انتقام کا ایک ہیجان تھا جس نے ان کو بالکل اندھا بہرا بنا دیا تھا۔ انھوں نے جس سوسائٹی کے ہاتھوں ذلتیں اٹھائی اور تکلیفیں جھیلی تھیں، چاہتے تھے کہ اس سے بدلہ لیں۔ اس سے زیادہ ان کو دنیا کی برائی اور بھلائی سے مطلب نہ تھا۔ انھوں نے معاملات پر کبھی اس نقطہ نظر سے غور نہیں کیا کہ وہ کیا صورتیں ہو سکتی ہیں جن سے دنیا کے بگڑے ہوئے حالات سدھر جائیں۔ ہمیشہ صرف اس پہلو سے غور کیا کہ وہ کیا تدبیریں ہو سکتی ہیں جن سے امراء و اغنیاء کے طبقہ کو گرایا جائے۔ اس کے لئے پہلی چیز جو سامنے آسکتی تھی وہ طبقاتی جنگ (Class war) کا کارگر ہتھیار ہے۔ پس انھوں نے یہی بھاری گرز اٹھایا اور سرمایہ داروں کے سر پر دے مارا۔ ان کے سامنے اس کا کوئی سوال نہ تھا کہ موجودہ سوسائٹی کو الٹنے کے بعد جو چیز اوپر کی سطح پر نمودار ہوگی وہ اوپر کی سطح پر آنے کے قابل بھی ہے یا نہیں۔ مارکس کے نزدیک غرباء کی جماعت میں کوئی عیب نہیں ہے۔ صرف خوبیاں ہی خوبیاں ہیں۔ البتہ ایک کمی ہو وہ یہ کہ وہ غریب ہیں پس اگر وہ غریب نہ رہیں تو پوری طرح اس کے لائق ہیں کہ اپنی اور دوسروں کی قسمت کی باگ اپنے ہاتھوں میں سنبھال سکیں۔ اسی طرح اس کو شاید سرمایہ داروں کے اندر سرمایہ داری کے سوا کوئی اور عیب نظر نہیں آتا کیونکہ اس کے نزدیک اگر ان سے ان کا سرمایہ چھین لیا جائے تو وہ سوسائٹی کے اسی طرح بہترین فرد بن جا سکتے ہیں جس طرح غرباء اور عوام غربت کی بیماری دور ہو جانے کے بعد۔

کارل مارکس کے اس عجیب وغریب اور بعض صورتوں میں قبائین فلسفہ پر حیرت ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ انسان کا درجہ صرف اسقدر سمجھتے ہوں کہ وہ ایک ذلیل حیوان کے درجہ سے تناسخ البقا کی راہوں سے، تمدن ومعیشت کے اس رتبہ کو پہنچ گیا ہے ان کو اگر اس کے اندر پیٹ کے سوا کوئی اور عنصر نظر نہیں آتا تو کچھ جائے تعجب نہیں۔ وہ نہ قرآن کے "ونفخت فیہ من روحی (اور اس میں اپنی روح پھونکی)" سے واقف اور نہ مسیح کے اس حکیمانہ ارشاد کے معتقد کہ "آدمی روٹی سے نہیں جیتا بلکہ اس کلمہ سے جیتا ہے جو خدا کی طرف سے آتا ہے"۔ ایسی حالت میں اگر مارکس ایک عفریت انتقام نہ بھی ہوتا بلکہ بان یونیورسٹی کا ایک فلسفی پروفیسر ہوتا جب بھی وہ یہی سمجھ سکتا تھا کہ اگر غربا اور عوام کے چہروں پر بھی دولت کا وہ گلگونہ مل دیا جائے جو امرا کے چہروں پر بمقدار وافر لپا ہوا ہے۔ تو وہ انسانی ترقی کی آخری حد کو پہنچ جائیں گے۔ کیونکہ وہ اسکا بالکل قائل نہیں ہے کہ انسان کے اندر بھی روح کے علاوہ جو پیٹ سے غذا پاتی ہے، کوئی رُوح ملکوتی بھی ہے جس کو انسان کے ظاہر وباطن کے بناؤ بگاڑ میں اصلی دخل ہے!!

پس اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے اس کو سیدھی راہ یہ نظر آئی کہ عوام اور غربا کو سرمایہ داروں کے خلاف بھڑکایا جائے۔ ان میں ان کی غربت وذلت کا احساس پیدا کیا جائے اور بتایا جائے کہ دولتمندوں کی ساری عیاشیاں تمہاری گاڑھی کمائی کی بدولت قائم ہیں، پس اٹھو اور ان سرمایہ داروں کو گرا کر اپنی کمائی کے مالک خود بنو۔ یہ دعوت جیسا کہ ہم نے پہلے دکھایا ہے، دنیا کی تاریخ کے ایک ایسے دور میں بلند ہوئی جو سرمایہ داری اور استعماریت کا سب سے زیادہ ملعون دور ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر اس نے اپنی حمایت کے لئے بہت بڑی بھیڑ اپنے اردگرد جمع کرلی۔

لیکن یہ بھیڑ ہے جماعت نہیں ہے۔ اس کے ظاہر وباطن کی بجز اس کے کوئی تربیت نہیں کی گئی ہو کہ اس کے اندر بھوک کا احساس پوری شدت کے ساتھ بیدار کردیا گیا۔ اور ظاہر ہے کہ ایک ایسی جماعت

جو بھوک سے مجنون ہو رہی ہو اور اخلاق، مذہب، شرافت اور قانون وشریعت کی نہ صرف یہ کہ اس نے کوئی تعلیم نہ پائی ہو بلکہ اس کے برعکس اس کو یہ پڑھایا گیا ہو کہ یہ سب سرمایہ داروں کے ڈھکوسلے ہیں تو وہ جو کچھ بھی کرگذرے وہ کم ہے۔ لیکن کارل مارکس اور اس کے ساتھیوں کو صرف اسی چیز کی ضرورت تھی کہ ایک ایسی جماعت ہاتھ آجائے جو سب کچھ کرگذرنے کے لئے تیار ہو بلکہ وہ ایک ایسی جماعت چاہتے تھے جو سب کچھ کرگذرنے کے بعد ان کی مٹھی میں ایک آلۂ بے جان کی طرح مطیع رہ سکے اور اس مقصد کے لئے ایسے عوام کی بھیڑ ہی موزوں ہو سکتی تھی۔ جو پیٹ اور روٹی کے سوا اور کوئی دوسری بات نہ جانتی ہو۔

مصلح اور طالب ملک | جو لوگ صرف ملک ومال کے طالب اور اصلاح کے جذبہ سے خالی ہوتے ہیں وہ ہمیشہ اپنے کاموں کا آغاز عوام کی بھیڑ سے کرتے ہیں اور اس کے چند وجوہ ہیں۔

۱- عوام کسی بات کے ماننے کے لئے عقل ومنطق اور حجت واستدلال کا انتظار نہیں کرتے۔ وہ ہر چیز کے سحر سے جلد مسحور ہوتے ہیں اور جب متاثر ہو جاتے ہیں تو اس کے اثر میں ان سے سب کچھ کرایا جا سکتا ہے وہ مسمریزم کے معمول یا کسی عامل کے موکل کی طرح تعمیل کریں گے۔ البتہ ایک بات کے جاننے کی ضرورت پڑتی ہے وہ یہ کہ کس چیز کی خواہش اور محبوبیت ان کے اندر سب سے زیادہ زوردار ہے۔ اگر اس طرح کی کوئی چیز ان کے اندر موجود ہے تو بس ان کو جو کچھ دیجئے اسی شکر میں لپیٹ کر دیجئے۔ ایلوا بھی ہو تو اس کو شہد وشکر کی طرح مزے مزے لیکر کھا جائیں گے۔ فرانس کے ایک ڈاکٹر کا قصہ ہے کہ وہ ایک مریض دیکھنے گیا، زمانہ وہ ہے جب فرانس کے ذرہ ذرہ سے جمہوریت کی صدائیں اٹھ رہی تھیں اور عوام کے لئے یہ لفظ جادو کا اثر رکھتا تھا۔ ڈاکٹر نے مریض کے قلب کی حالت معلوم کرنے کے لئے کان دل پر لگایا اس وقت یہ حرکت قلب معلوم کرنے کا آلہ غالباً وجود میں نہیں آیا تھا، لیکن غلطی سے بجائے بائیں طرف کے اس نے داہنی طرف کان لگا دیا کہ بھلا دل جیسی اشرف چیز بائیں طرف کیوں ہوگی! جو لوگ پاس کھڑے تھے وہ ڈاکٹر کی اس حماقت پر ہنس دئے۔ ڈاکٹر نے اپنی غلطی محسوس کی اور سوچا کہ اگر اس نے اس غلطی کی

موزوں طریق پر تلافی نہ کی تو اس کے پیشہ پر اس کا نہایت برا اثر پڑے گا۔ اس نے لوگوں سے ہنسنے کی وجہ پوچھی؟ لوگوں نے جواب دیا دل بائیں طرف ہوتا ہے نہ کہ داہنی طرف اڈاکٹر نے نہایت اطمینان و وقار کے لہجہ میں جواب دیا "جمہوریت کے بعد یہ سارے نظام ہم نے بدل ڈالے"!!

یہ قصہ واقعہ نہیں ہے محض تخئیلی قصہ ہے جو تبیر حقیقت کے لئے بنا لیا گیا ہے کہ عوام کے دلوں میں اگر کسی چیز کی محبوبیت پوری طرح رچی بسی ہوئی ہو تو اس چادر میں لپیٹ دینے کے بعد چڑیل بھی لیلیٰ نظروں میں لیلیٰ سے زیادہ شیریں کار اور شیریں سے زیادہ دلفریب وعشوہ طراز بنجاتی ہے اور پھر وہ اس پر سو سو جان سے نثار۔ آج اس کی بہترین مثال ہماری مسلم لیگ کا طرز عمل ہے جو اسلام خطرہ میں کا ایک منتر ایسا ہاتھ آگیا ہے کہ وہ جس غلط سے غلط بات کو چاہے اس کی مدد سے لاکھوں دلوں کے اندر شریعت کے ایک منصوص اصول کی حیثیت سے اتار دے۔

اور اگر عوام کے دلوں میں کسی چیز کے لئے اس طرح کی کوئی محبوبیت اور طلب موجود نہ ہو تو پھر یہ چیز پیدا کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ کانگریس کا ایک سکشن عرصے عوام میں روٹی کی بھوک پیدا کرنے میں سرگرم کار ہے۔ اور پنڈت جواہر لال نہرو اس کی قیادت کر رہے ہیں۔ اس جماعت کے پیش نظر بلزاک کا وہی مقولہ ہے جو ہم اوپر کہیں نقل کر آئے ہیں کہ "اصلی غریب وہ ہیں جن کو اپنی غربت کا احساس تک نہ ہو" پس وہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کے اس سوتے ہوئے اژدہے کو جگا دیں۔

۲- دوسری وجہ یہ ہے کہ عوام پروپگنڈے کے سحر سے مسحور ہو کر سب کچھ کر گذرنے کے باوجود نہ تو مطالبہ کسی چیز کا کرنا جانتے اور نہ کوئی چیز پا کر اس کو برت سکتے۔ ان میں یہ صلاحیت ہی نہیں ہوتی کہ وہ کسی کام کو اپنے ارادے سے کریں یا اپنی عقل سے سوچیں۔ وہ صرف محکوم اعضاء یا مجبور مشین کی طرح چل سکتے ہیں اور ہمیشہ کسی عامل ہاتھ یا کارفرما دماغ کے محتاج رہتے ہیں۔ چنانچہ جن لوگوں نے روس کے انقلابات کی تاریخ پڑھی ہے وہ واقف ہوں گے کہ پہلے انقلاب کے بعد جب عوام خون کے متلاطم سمندر کے اندر سے

اپنی آزادی کا در بے بہا لیکر نکلے تو اس کو اسی بدبخت ڈوما (Duma) کے حوالے کیا جو زار کی قائم کی ہوئی تھی اور جس کی ناانصافیوں اور تعدیوں سے چھوٹنے کے لئے انھوں نے آگ اور خون کی ہولی کھیلی تھی لیکن اب کہ یہ جنت کا سیب "مزدوروں کے ہاتھ آگیا تو نہیں جانتے تھے کہ کیا کریں اور کسطرح تراش کر چکھیں اور مجبور ہوئے کہ اس کو انہی کے پاس لیجائیں جن کو انھوں نے کل "چور" اور "ڈاکو" کے القاب سے یاد کیا تھا۔

پس جو لوگ صرف ملک کے طالب اور اقتدار کے بھوکے ہوتے ہیں وہ عوام کی اس ہیجانی بالکل غیر منطقی افتاد مزاج سے فائدہ اٹھانے کے بڑے خواہش مند ہوتے ہیں کیونکہ اس شکل میں ان کی مطلق العنان آمریت (ڈکٹیٹر شپ) آپ سے آپ قائم ہوجاتی ہے۔ اور ڈانڈ ہانکا اور بہروں کی ایک لق و دق بھیڑ اپنے بین و یسار جمع کر لیتے ہیں جو ان کے حکموں کی تعمیل میں تو شیر کی طرح تند اور ہوتی ہے اور جب شکار لا کر ان کے سامنے رکھ دیتی ہے تو پھر دور کھڑی ہو کر کتوں کی طرح دم ہلاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر آدمی مصلح نہیں ہے بلکہ ڈکٹیٹر ہے تو اس منظر سے زیادہ دلفریب منظر اس کے لئے دنیا میں کوئی نہیں ہوسکتا۔ مارکس اور انجلس وغیرہ اسی قبیل کے لوگ ہیں تھے۔ اور انہی کے تصورات کی روح تھی جس نے لینن ٹراٹسکی اور اسٹالین کے جسموں میں حلول کیا اور دنیا تسلیم کرے گی کہ اگر اسی صف میں روس کے بدبخت بادشاہ زار کے نام کا بھی اضافہ کر دیا جائے تو یہ اضافہ ناموزوں نہ ہوگا گو زبانوں سے اس کا کتنا ہی انکار کیا جائے۔ ہماری ہندوستان کی موجودہ تحریک میں بھی اصلاح اور آمریت کے یہ دونوں رجحان ابھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک کے نمائندہ گاندھی جی قرار دیئے جا سکتے ہیں اور دوسرے کے پنڈت جواہر لال نہرو۔ گو یہ دونوں رجحانات بعض مرتبہ مختلط ہوجانے کی وجہ سے کچھ دھندلے ہوجاتے ہیں لیکن اتنی بات غیر مشتبہ ہے کہ مقدم الذکر ملک کے دماغ اور ضمیر کو بیدار کرنا چاہتے ہیں اور موخر الذکر صرف پیٹ اور عوام کو۔

۳- اسی دوسری بات سے کچھ ملتی جلتی ہوئی ایک وجہ اور بھی ہے جس کی وجہ سے اقتدار پرست اشخاص کا تمامتر اعتماد عوام کی طاقت پر ہوتا ہے۔

اغنیاء و سرمایہ داروں کا طبقہ ذہنی اور دماغی اعتبار سے عوام اور غرباء کے مقابل میں بلند ہوتا ہے۔ اگر ان کی اصلاح کر کے ان کو کسی نظام میں لایا جائے تو گو ان کی اصلاح دیر طلب ہوتی ہے، لیکن تبدیلی کے بعد ان کی قابلیت سے اس نظام کو بیش از بیش فوائد حاصل ہوتے ہیں، ازانجملہ ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس نظام کے مزاج میں جمہوریت کی شان پیدا ہوتی ہے۔ اور کبھی بری آمریت کا تخم فساد پرورش نہیں پاتا۔ یہ بات اپنی جگہ پر نہایت قیمتی ہے اور اصولی حیثیت سے دنیا کا کوئی عاقل انسان اس کی برتری کا انکار نہیں کر سکتا، مگر اقتدار پرست اس چیز کو کبھی نہیں پسند کرتا کہ اس کی سی ذہنی اور دماغی قابلیت رکھنے والے اور بھی ہوں، اس سے اس کی مطلق العنانی پر زد پڑتی ہے۔ اس کو عوام کی بھیڑ چاہئے جو بے چون وچرا اس کے حکموں کی تعمیل کرے نہ کہ عاقلوں اور ہشیاروں کی ایک جماعت جو اس پر تنقید کرے اور اس کے اقتدار میں شریک ہو سکے۔ پس ایسی جماعت اس کو ہرگز پسند نہیں جو کسی طرح کی ذہنی بلندی رکھتی ہو۔ مرحوم غالب نے ایک اور عالم کی بات کہی ہے لیکن خوب کہی ہے۔

الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ　　جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

پس اس طرح کے اشخاص عوام کی طاقت سے کام لیکر ہمیشہ سوسائٹی کے اس طبقہ کو جو اپنی ذہنی و معنوی بلندی رکھتا ہے یا تو بالکل ختم کر دیتے ہیں یا اس کو اس قدر کچل دیتے ہیں کہ پھر اس میں ابھرنے کی کوئی صلاحیت باقی نہ رہ جائے اور ان کی لاشوں پر اپنی مطلق العنان آمریت قائم کر لیتے ہیں۔

قطع نظر اس سے کہ اس طرح قوم کا اصلی اور عمدہ طبقہ جو اصلاح کے بعد قوم کیلئے اکسیر کا کام دے سکتا ہے عوام کے قدموں سے روند کر خاک میں ملا دیا جاتا ہے اس کا سب سے زیادہ خوفناک پہلو یہ ہے کہ ایسے نظام میں انقلابی سازشوں کے بے شمار جتھے قائم ہو جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے یہ نظام ہمیشہ

متزلزل رہتا ہے۔ اور اس کی پوری تاریخ، سازشوں، پھانسیوں، ہولناک مقدموں کی ایک لامتناہی مسل بنجاتی ہے۔

اس کے وجوہ بیشمار ہیں جن کی تفصیل کا یہ محل نہیں لیکن ایک وجہ نہایت واضح ہے جو آسانی سے ہر شخص سمجھ سکتا ہو وہ یہ کہ اس نظام میں عوام کی جو بھیڑ ہوتی ہے وہ بالکل بے تربیت ہوتی ہے۔ کوئی خاص ترغیب ان کو جمع کر دیتی ہے۔ عقلی و ذہنی اعتبار سے وہ بالکل صفر ہوتے ہیں۔ اور خواص جو قتل عام سے بچکر آتے ہیں وہ اس نظام کے معتقد اور قائل ہو کر نہیں آتے بلکہ تباہی اور بربادی کے خوف سے مرعوب ہو کر آتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ نظام دو فاسد عنصروں کا مرکب بنجاتا ہے۔ ایک عنصر ذہنی اعتبار سے نسبتہً بلند مگر اندر اس نظام کا سخت دشمن ہوتا ہے اور اس کو الٹ دینے کے لئے ہر وقت مصروف سازش رہتا ہے اور دوسرا عنصر غیر تربیت یافتہ ہونے کی وجہ سے ہر صدا کو سننے اور قبول کرنے کے لئے آمادہ رہتا ہے اور جب ایسے دو عنصروں میں فعل و انفعال، اور کسر و انکسار ہوگا تو اس کا لازمی نتیجہ وہ مولود فساد ہے جس کو سازش کہتے ہیں اور سازش یا سازش کا اندیشہ ایک طرف تو ڈکٹیٹر کی گرفت کو فرعون سے زیادہ سخت کرتا جاتا ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے کسی بچہ کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہتا اور دوسری طرف ملک اس کو تباہیوں پہ ساور فیصلہ کو دیتا ہو کہ بلا پر پہنچ کے کسی معمولی جھونکے سے پھٹ کے رہتا ہے۔

میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی　　ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

ہمارے اس دعوی کا بہترین ثبوت آج وہی سرزمین پیش کر سکتی ہے جس کو ہمارے اشتراکی احباب "مزدوروں اور غریبوں کی بہشت" کہتے ہیں اور جہاں "اسٹالین" سورج کی طرح روزی اور روشنی بخشتا ہے"۔ اگر ہم صرف ایک سال کے ان مقدمات سازش و بغاوت کی تفصیل پیش کرنا چاہیں جن پر "سوویٹ انکوزیشن" نے اپنے احکام نافذ کئے ہیں تو ممکن ہے مقدمات کے بیان کرنے کے لئے ان صفحات میں گنجائش نکل آئے لیکن ان بیشمار جانوں کے اعداد و شمار کون بتا سکتا ہے جو ان نادری احکام کی نذر ہوئیں!!

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں۔

مصلح کی راہ اس راہ سے بالکل الگ ہوتی ہے۔ اس کی دعوت سب سے پہلے غربا اور عوام کی جگہ امرا اور اغنیا کو مخاطب کرتی ہے۔ مصلحین کے لئے بہترین اسوہ انبیاء کرام کا طرز عمل ہے۔ اس لئے ہم انبیاء کرام کے طرز عمل کو یہاں نہایت اختصار کے ساتھ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ تفسیر سورہ لہب میں فرماتے ہیں۔

"ہمیشہ سے انبیاء علیہم السلام کا طریق دعوت یہی رہا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زجر و توبیخ کے سب سے پہلے ہدف علمائے یہود ہوئے کیونکہ امانت الٰہی کے حامل ہونے کی وجہ سے سب سے پہلے بازپرس کے مستحق وہی تھے۔ علماء عوام کے امام ہوتے ہیں، اس لئے ہدایت و اصلاح کی دعوت سب سے پہلے انہی کو مخاطب کرتی ہے کہ ان کی اصلاح عوام کی اصلاح کا ذریعہ ہو۔ اگر انبیاء کرام (علیہم السلام) اپنی دعوت میں رہبران قوم سے اغماض کر جاتے تو یہ دین کے معاملہ میں ناجائز چشم پوشی ہوتی۔ اور دعوت حق کا تمام کاروبار درہم برہم ہو جاتا۔ یہ طریق دعوت باغیوں اور طالبین ملک و دولت کا ہے جو ہمیشہ عوام کو ورغلا کر اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی مقام انبیاء کرام اور طالبین ملک وجاہ کے درمیان نقطۂ امتیاز ہے۔ جہاں سے دونوں جماعتوں کی راہیں الگ الگ ہو جاتی ہیں۔"

"دیکھو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدا نے حکم دیا کہ سب سے پہلے فرعون کو مخاطب کریں۔

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى فَقُلْ	فرعون کے پاس جاؤ اس نے سرکشی کی، اور کہو کیا
هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى وَاَهْدِيَكَ	میں تجھے تلقین کروں کہ تو پاکی حاصل کرے اور
اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى (عبس ۱۷-۱۹)	تیرے رب کی راہ سوجھاؤں کہ تو اس سے ڈرے

"حضرت دانیال علیہ السلام نے اپنے وقت کے شہنشاہ اعظم بخت نصر (جس کو لوگ بخت نصر کے نام سے جانتے ہیں) کو دعوت دی۔ یرمیاہ نبی نے شمال کے بادشاہوں پر نبوت کی اور حضرت خاتم النبیین صلعم نے متعدد سلاطین عالم کو دعوت اسلام کے نامے لکھے۔ (تفسیر سورہ لہب اردو صفحہ ۷)

(باقی)

حکمت غرب

مارکس اریلیس کے بہترین خیالات

(۹)

جناب مولوی نیاز احمد صاحب صدیقی ایم اے

بہ رضا و رغبت اپنے تئیں قسمت کے حوالہ کر دے تاکہ وہ تیری زندگی کو جس قالب میں چاہے ڈھال دے

ہر شے بالکل عارضی و چند روزہ ہے۔ یاد کرنیوالے اور وہ جنکی یاد کیجاتی ہے دونوں ایک ہی طرح جلد مٹ جائیں گے۔

اس بات پر ہمیشہ غور کر کہ موجودات عالم کا بقا صرف انقلاب و تبدیلی کا رہین منت ہے۔ اس کو اچھی طرح سمجھ لے کہ قدیم نظام کو بدلنا اور اسکی جگہ ویسا ہی نیا نظام قائم کرنا کائنات عالم کا محبوب ترین شغل ہے۔ حال مستقبل کی تخم ریزی کرتا ہے اور اس کا گہوارہ ہوتا ہے گو تیرے خیال میں بجز اس بیج کے جس کی بارآوری زمین یا شکم میں ہوتی ہے کسی اور بیج کا وجود ہی نہیں۔ اصل یہ ہے کہ یہ ایک مجہول علم فلسفہ ہے۔

تیری موت قریب آن پہنچی ہے اور تو آج بھی سادگی اور سکون و عافیت سے بیگانہ، تو لوگوں کے ساتھ اپنا وہی رویہ رکھتا ہے جو ہمیشہ سے تھا۔ اور تو آج بھی بیرونی چیزوں سے نقصان کا خطرہ محسوس کر رہا ہے اور اس بات کو سمجھنے سے اب بھی عاری ہے کہ عقل سلیم یہ ہے کہ عمل صحیح و سالم ہو۔

جن اصولوں کی کارفرمائی لوگوں پر ہے ان کو بہ نظر غائر دیکھ۔ عقلمند لوگوں کے اصولوں پر بھی نظر ڈال اور یہ دیکھ کہ وہ لوگ کن چیزوں کو اختیار اور کن چیزوں سے اجتناب کرتے ہیں۔

جو کچھ تیرے لئے معصیت ہے اس کا سرچشمہ نہ تو کسی کا دل ہے اور نہ تیری جسمانی تبدیلیاں پھر اس کا سرچشمہ کہاں ہے؟ تیرے اندر جہاں وہ قوت موجود ہے جو ہر ایک چیز پر بدی کا حکم لگاتی ہے وہیں اس کا بھی سرچشمہ ہے۔ پس اگر یہ عدالت اپنا فیصلہ صادر کرنے سے باز رہے تو پھر سب کچھ ٹھیک اور درست ہوگا۔ اگرچہ اس عدالت کا قریب ترین ہمسایہ یعنی تیرا جسم زخمی، داغدار، گرم لوہے سے داغا ہوا) پر ناسور اور انحطاط پذیر ہو تب بھی اس عدالت کو جوان آزار پر فیصلہ صادر کرنے کی بجائے سکوت ہی اختیار کرنا چاہئے۔ بہ الفاظ دیگر اس عدالت کا فیصلہ یہ ہونا چاہئے کہ کوئی ایسی چیز اچھی یا بری نہیں ہو سکتی جس کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اچھے اور برے دونوں پر یکساں نازل ہوگی کیونکہ جو کچھ نوشتہ تقدیر سے بلا امتیاز و فرق اس انسان پر بھی جو فطرت سے ہم آہنگ ہے اور اس انسان پر بھی جو فطرت سے منحرف ہے دونوں پر نازل ہوتا ہے وہ نہ تو فطرت کے مطابق ہے نہ اس کے خلاف۔

اس خیال کو ہمیشہ ذہن میں رکھ کہ کائنات فطرت ایک اور صرف ایک زندگی کی حامل ہے جو ایک ہی مادہ اور ایک ہی روح پر مشتمل ہے۔ اس بات پر نگاہ رکھ کیونکہ تمام چیزیں اس واحد عالمگیر تصور سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان سب پر ایک ہی تحریک طبعی کارفرما ہوتی ہے۔ یہ سب آفرینش عالم کے اسباب بھی ہیں۔ یہ ایسے تار ہیں جو ناقابل تحلیل طور پر باہمدگر منسلک ہو کر کپڑے کے بنے ہوئے تھان کی شکل میں ہو گئے ہیں۔

(باقی)

تقریظ و تبصرہ

بنی اسرائیل کا چاند: ۔ مصنفہ رائڈر ہیگرڈ مترجمہ جناب عبدالمجید حیرت بی اے علیگ۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۴۴۰ صفحے۔ کتابت و طباعت صاف ستھری۔ کاغذ سفید چکنا۔ جلد خوبصورت۔ گردپوش جاذب نگاہ۔ قیمت عا

پتہ: ۔ مکتبہ جامعہ دہلی، و مکتبہ لاہور

سر رائڈر ہیگرڈ کا یہ مشہور تاریخی ناول ہے۔ اس میں عہد فرعون کے حالات و واقعات، سیتی ولیعہد حکومت کے عاشقانہ کارناموں، عبرانیوں کی مظلومی، مصر کی بربادی، فرعون کی تباہی، اور ایک عبرانی لڑکی میرآپی و شاہزادہ سیتی کے تعلقات حسن و عشق اور بالآخر ان کے ذریعہ بنی اسرائیل کی آزادی کی داستان نہایت دلچسپ انداز میں بیان کی گئی ہے۔

واقعات و حالات کی نوعیت گو یہ عہد حاضر کے واقعات و حالات سے بالکل مختلف ہے اور محاورات کا جو انداز اختیار کیا گیا ہے اس میں بھی کہیں کہیں پیچیدگی پائی جاتی ہے تاہم مترجم کی کوشش قابل ستائش اور لائق مبارکباد ہے۔ افسانہ کی روایتی حیثیت سے قطع نظر ترجمہ اتنا صاف، شستہ اور رواں ہے کہ اس پر اصل کا دھوکہ ہوتا ہے۔

ذکر غالب: ۔ مؤلفہ جناب مالک رام ایم اے۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۲۰۳ صفحے۔ کاغذ و کتابت و طباعت عمدہ۔ قیمت ۸/ پتہ: ۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔

غالب پر مولانا حالی کی یادگار غالب کے بعد گو اس وقت تک متعدد اچھی کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن باوجود ان کے ضرورت تھی کہ ایک مختصر اور جامع کتاب ایسی لکھی جائے جس سے ہر ضرورتمند فائدہ اٹھا سکے۔ پیش نظر کتاب نے اس ضرورت کو پورا کر دیا ہے۔ اس کتاب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں اختصار کے باوجود جامعیت ہے اور حتی الامکان غالب کی زندگی کا کوئی گوشہ دھندلا نہیں چھوڑا ہے۔ بلکہ بعض

حالات کا اضافہ ہے۔ ترتیب واقعات میں ترتیب سنین کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ مولف نے کتاب کے اندر مرزا غالب کا ایک بالکل نیا فوٹو اور ان کے آگرے والے مکان کی تصویر بھی دی ہے۔ غرض غالب کی زندگی کے صحیح اور اجمالی مطالعہ کے لئے یہ کتاب بہت مفید ہے۔

بیوہ :- مصنفہ منشی پریم چند آنجہانی۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۱۰۰ صفحے۔ کاغذ اور کتابت و طباعت عمدہ۔ قیمت عہ۔ پتہ :- مکتبہ جامعہ دہلی۔

یہ ناول عرصہ ہوا ہماری نظر سے گذرا تھا۔ جامعہ نے اپنے خاص اہتمام سے اسکا دوسرا اڈیشن شائع کیا تو ایک بار پھر اسے پڑھنے کو جی چاہا۔ منشی جی کے اور ناولوں کی طرح اس ناول میں بھی ہندو معاشرت کے ایک فاسد عضو کی اصلاح مدنظر ہے۔ سوسائٹی کا یہ ناکارہ عضو بیوہ ہے۔ اب سے چند برس پیشتر تک ہندو سوسائٹی میں بیوہ کیلئے کوئی جگہ نہ تھی۔ اور اس بےکسی مپرسی کی وجہ سے جو برائیاں پھیلتی تھیں وہ سوسائٹی کے لئے نہایت شرمناک تھیں۔ اصلاح پسند اور روشن خیال طبقے نے مجبور و ستم رسیدہ طبقہ کی طرف توجہ کی اور ودھوا آشرم" "بیوہ گھر" اور "ودھوا بواہ" "عقد بیوگان" کی تحریک شروع کی۔ منشی جی نے اپنے اس ناول میں اسی طبقہ کے خیالات اور اصلاحی تحریکوں کی ترجمانی کی ہے۔ اور بیوہ کی غلطی، بیوہ خانہ کی ضرورت، جنسی ترغیبات، اسکی کشاکش اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے طریقے نہایت دلچسپ انداز میں بیان کئے ہیں۔ "امرناتھ" اور "پریا" کی سیرت نگاری کا فرض جس خوبی سے نباہا ہے وہ منشی جی کا خاص حصہ ہے۔

دلی کی دوسو برس کی تاریخ :- مصنفہ مولوی سید حسن برنی ایم اے۔ ال ال بی۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۴۸ صفحے۔ کتابت و طباعت بہترین۔ کاغذ نفیس قیمت مرقوم نہیں غالباً ۶ ہے۔ پتہ :- مکتبہ جامعہ دہلی۔

یہ مقالہ جامعہ ملیہ کی اردو اکیڈمی کے ایک خاص جلسہ میں پڑھا گیا تھا مکتبہ جامعہ نے اسکو کتابی صورت میں چھاپکر شائع کیا ہے۔ اس مقالہ میں حملہ تیمور سے قبل دلی کی دوسو برس کی تاریخ پر تحقیقی نظر ڈالی گئی ہے ...... اور قریب قریب تمام ممکن الحصول ماخذوں سے کام لیکر اسلامی اور ہندوستانی تمدن کا ربط اور انکا باہمی

ارتقاء دکھلایا گیا ہے۔

دلی :- مصنفہ جناب محمود علی خاں جامعی۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۶۴ صفحے۔ کتابت و طباعت اور کاغذ نفیس قیمت ۴ر۔ پتہ :- مکتبہ جامعہ دہلی۔

یہ دلچسپ اور مفید کتاب بچوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ مختلف ادوار کے تخت دلی کے بار بار اجڑنے اور مختلف جگہوں پر آباد ہونے کے وجوہ، دلی کے مختلف زمانوں کی خصوصیات اور مشہور عمارتوں کے مختصر حالات بیان کئے گئے ہیں۔ جابجا آٹھ نو مشہور عمارتوں کی تصویریں بھی لگا دی گئی ہیں۔ زبان نہایت آسان اختیار کی گئی ہے تاکہ بچوں کو بھی اس کے مطالعہ میں زحمت نہ ہو۔

ضرب الامثال :- مولفہ جناب خواجہ محمد عبدالمجید دہلوی۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۱۲۰ صفحے۔ کتابت و طباعت اور کاغذ عمدہ۔ قیمت ۸ر ملنے کا پتہ :- مکتبہ جامعہ دہلی۔

اس کتاب میں اردو زبان کی مشہور امثال کی تشریح کی گئی ہے اور جو واقعات اور قصے ان سے متعلق ہیں بیان کئے گئے ہیں۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان قصوں میں کہاں تک واقعیت ہے۔

امثال کا معاملہ ہر زبان میں اپنے اندر ایک خاص اہمیت رکھتا ہے ضرورت ہے کہ اس پر جو کچھ لکھا جائے پوری تحقیق اور احتیاط کے ساتھ لکھا جائے اس فکاہی طرز تحریر سے تو غلط رہبری کا اندیشہ ہے۔

یاد پڑتا ہے کہ جس زمانہ میں نور اللغات و جامع اللغات پر لکھنو کے مشہور ظریف ادبی اخبار اودھ پنچ میں سلسل تنقید شائع ہو رہی تھی اسی زمانہ میں امثال پر بھی ایک لمبا سلسلہ اس کے اندر شائع ہوا تھا اور جہاں تک ہمارا خیال ہے اس کی تشریحات مفصل اور زیادہ لگتی ہوئی تھیں۔ وہ سامنے ہوں تو پتہ چلے کہ مولف موصوف کی یہ ابتدائی کوشش کہاں تک کامیاب ہے اور نقش ثانی میں ان کو کن اضافوں کی ضرورت ہے۔

مینائے حجاز :- نتیجۂ افکار جناب مولوی حافظ محمد ولی الدین شفیق صدیقی جونپور۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶

حجم ۴۸ صفحے، کتابت و طباعت، کاغذ معمولی۔ قیمت ۴ر۔ پتہ: شفیق صدیقی فخر جونپوریاو بیگ اسکول یتیم خانہ جونپور۔

یہ چھوٹا سا رسالہ چند مدحیہ قصائد اور سلاموں پر مشتمل ہے۔ ہم نے الٹ پلٹ کر بعض سلام پڑھے عموماً اشعار صاف و سلیس، حب رسول، محبت آل بیتؓ اور منقبت خلفائے کرامؓ کے آئینہ دار ہیں۔

حیات ادیبۃ النساء:۔ مرتبہ مصنف مذکور۔ تقطیع ۲۰×۲۲/۱۶ حجم مع سرورق ۲۰ صفحے۔ کتابت، طباعت کاغذ نہایت معمولی قیمت ۲ر۔ پتہ مذکورۃ الصدر۔

اس رسالہ میں بریلی کی ایک شاعرہ خاتون بلقیس بیگم صاحبہ جمالؔ کی مختصر سوانح عمری بیان کی گئی ہے۔ ان کی شاعرانہ و ادبی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے کلام کے چند متفرق نمونے پیش کیے گئے ہیں اور ایک آدھ غزلوں پر مصنف کی بھی تضمین ہے۔

اشرف القواعد۔ مرتبہ جناب مولوی محمد یعقوب شاہجہانپوری۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۳۲ صفحے لکھائی چھپائی صاف و ستھری، کاغذ عمدہ۔ قیمت ۱ر۔ پتہ کتبخانہ تعلیمی۔ قرول باغ۔ دہلی۔

ہم نے اس قاعدہ کو شروع سے آخر تک بغور دیکھا، ہمارے خیال میں یہ قاعدہ بڑی محنت اور سلیقہ سے لکھا گیا ہے اور قرآن کی ابتدائی تعلیم کے لئے نہایت مفید ہے۔ اس کے اندر جو ہدایات لکھی گئی ہیں اگر ان کے مطابق تعلیم دیجائے تو یقیناً صرف چند ماہ کی محنت میں بچے قرآن مجید کی تعلیم آسانی سے ختم کر سکتے ہیں۔

ع۔ ن

تفسیر سورۃ الفیل

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سورۃ الفیل کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب کی ہر فصل ایک مستقل کتاب ہے۔ واقعہ فیل کی اصل حقیقت اس کتاب کی اشاعت سے پہلے بالکل مجہول تھی، علامہ فراہیؒ نے کلام عرب کی مدد سے واقعہ کی تمام تفصیلات فراہم کر کے تمام تاریخی غلطیوں کو بے نقاب کر دیا ہے۔ واقعہ کو بھی عجائب پرستی نے بالکل دوسرا رنگ دیدیا تھا۔ مولاناؒ نے اس واقعہ کے متعلق بھی عینی شاہدوں کی شہادتیں جمع کر کے اس کی اصل حقیقت کو آشکارا کر دی ہے اور اسی سلسلہ میں رمی جمرات اور حج کے دوسرے مراسم کے اسرار و حکم نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمائے ہیں۔ کتابت و طباعت بہترین، کاغذ عمدہ حجم ۱۱۳ صفحے۔ قیمت ۸ر

تفسیر سورۃ کافرون

اس میں ہجرت اور برات کا اصلی فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔ اور نبوت کے مراحل و مقامات کی توضیح اس قدر حکیمانہ انداز میں کی گئی ہے کہ قرآن مجید کی بے شمار مشکلات آپ سے آپ حل ہوگئی ہیں۔ کتابت و طباعت بہترین۔ کاغذ عمدہ۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۴۸ صفحے قیمت ۴ر

اسباق النحو حصہ اول و دوم

اردو زبان میں عربی صرف و نحو کے بہترین رسالے ہیں۔ قیمت حصہ اول ۵ حصہ دوم ۶ر

تحفۃ الاعراب

اردو زبان میں عربی نحو کے مسائل نہایت بہترین طریقہ سے بیان کئے گئے ہیں۔ قیمت ۲ر

منیجر